قرآنی مطالعہ کے بنیادی اصول

: از :

امامِ انقلاب مولانا عُبَیدُاللہ سِندھی رحمۃ اللہ علیہ

: مرتّب :

مولانا محمّد مہاجر مدنی تلمیذِ حضرت امام سِندھی رحمہما اللہ

قرآنی مطالعہ کے بنیادی اصول

حصہ اوّل —— قرآن کا مطالعہ کیسے کیا جائے؟

پہلا باب — قرآن مجید کی تعلیم کا اثر

گزشتہ[1] کانفرنس منعقدہ آگرہ میں خاکسار نے ایک مضمون پڑھا تھا، جس میں زیادہ تران دو امور پر بحث کی گئی تھی کہ ہماری قوم کے جدید طبقے میں مذہبی تعلیم کی کس حد تک ضرورت ہے اور اس طبقے کی مذہبی تعلیم کے لیے کس قسم کے مضمون کی ضرورت ہے۔ اس مرتبہ میں قرآن مجید کے متعلق اپنی ناچیز رائے عرض کروں گا۔ یہ فقط قرآن مجید کی تعلیم کا اثر تھا کہ چند سال کے عرصہ

---

[1] رسالہ کے پہلی اشاعت کے پیش لفظ میں ناشر جناب عبدالرحمان صاحب تحریر فرماتے ہیں "یہ رسالہ "قرآن کا مطالعہ کیسے کریں؟" دراصل مولانا عبیداللہ سندھی رح کا خطبہ صدارت ہے جو ۱۹۱۴ء میں (جیسا کہ خطبہ کے خاتمہ سے ظاہر ہے) آپ نے غالباً آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ راولپنڈی میں پڑھا۔ چونکہ مطبوعہ خطبہ دستیاب نہ تھا اس لئے ایک نقل شدہ کاپی سے اسی زمانہ میں جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ میں نے دو نقلیں کیں ایک اُستاذی المکرم مولانا نور الحق مرحوم پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور کے لئے اور ایک اپنے لئے مختلف وجوہات اور گونا گوں حالات نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ ان بیش قیمت اور معلومات افزا خیالات کو جو اس خطبہ میں پیش کئے گئے ہیں اس سے پہلے کسی نہ کسی صورت میں پبلک کے سامنے پیش کرتا۔ لیکن اب میں نے محسوس کیا ہے کہ مزید تاخیر ٹھیک نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو پیش لفظ "قرآن کا مطالعہ کیسے کریں طبع اول لاہور" ۱۲

[2] اس کے پہلے مزید "قرآن کا اعجاز و تاثیر قرآن" مقالہ جات از حضرت امام سندھی رح شعور و آگہی سے مطالعہ کیا جائے ۱۲

[3] قرآنی مطالعہ کے بنیادی اُصول کا پہلا حصہ امام سندھی رحمۃ اللہ کا وہ تحریری خطبہ ہے جو آپ نے بطور خطبہ صدارت ۱۹۱۴ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں پیش فرمایا اور دوسرا حصہ جو آگے آرہا ہے وہ مولانا محمد مہاجر نے حضرت سندھی رح سے سن کر قلمبند کیا ہے۔

(ناشر)

میں عرب کے بُت پرست اور جاہل لوگ[1] دنیا میں سب سے زیادہ خدا پرست سب سے زیادہ متمدن سب سے زیادہ مہذب اور سب سے زیادہ طاقتور بن گئے۔

---

[1] حضرت امام سندھیؒ کے نزدیک شاہ صاحب کے مسلک کے مطابق قرآن کے اصل مخاطب قریش مکہ ہیں نہ کہ عرب کے جاہل بدّو، چنانچہ شعور و آگہی صفحہ ۹۴ تا ۹۶ میں فرماتے ہیں "مکہ کے قریش کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ عرب کے دیگر بدو قبائل کی طرح ایک قبیلہ تھا، صحیح نہیں، صحرائی و بدوی زندگی اور اس کے لوازمات وخصائص جو دوسرے بدوی قبائل میں موجود تھے قریش ان سے بہرہ ور تو ضرور تھے لیکن عرب کی بدوی ذہنیت کا نمونہ نہ تھے۔ قریش کی اپنی خاص روایات تھیں اور قصیؔ کے زمانہ سے مکہ کی اجتماعی اور سیاسی زندگی میں ایک نظم چلا آتا تھا۔ نیز تجارتی قافلوں کی وجہ سے قریش کو ہمسایہ ملکوں میں آنے جانے کا موقع ملتا تھا اور حج وعکاظ کے میلے کے موقعوں پر عرب قبائل سے بھی ان کے راہ و رسم پیدا ہو جاتے تھے، یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے قریش ایک طرف مشرق قریب کے تمدنی سرمایہ اور ذہنی روایات سے واقف تھے اور دوسری طرف قبائل کی بدویانہ خصائل سے بھی نابلد نہ تھے، چنانچہ قرآن کے بلند معانی اور اعلیٰ مضامین قریش کے لئے اجنبی نہ تھے وہ یہودی اور نصرانی روایات کو بھی سمجھتے تھے اور قرآن میں علم وحکمت کی جو باتیں بیان کی جاتی تھیں۔ ان سے بھی محظوظ ہوتے تھے۔ البتہ ان کے دماغوں میں اپنا کوئی واضح اور مستقل فکر نہ تھا اور اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی مادی اغراض میں اس طرح اُلجھے ہوتے تھے کہ وہ ادھر توجہ نہیں کرتے تھے، قرآن کو عرب کی بدوی ذہنیت کا ترجمان کہنا سخت غلطی ہے، قرآن کا خطاب تو قریش کی ترقی یافتہ سوسائٹی کی طرف تھا مکہ میں قریش کا اپنا باقاعدہ نظام تھا۔ تجارتی اور سیاسی معاملات سلجھانے کے لئے قواعد وضوابط تھے۔ قومیت کا ان کا اپنا ایک مخصوص تصور تھا اور انہوں نے اس سلسلہ میں ایسی مذہبی رسوم بنالی تھیں جو ان کے مادی اور جماعتی مفاد کے لئے مفید تھیں اور اس کی وجہ سے بدو قبائل میں ان کا مذہبی وقار بھی قائم ہوتا تھا اور اس عہد کے ایک محقق کے الفاظ میں متعدد کاروانی راستوں کا اہم جنکشن ہونے کی وجہ سے یہاں کی آبادی میں یک نسلی نہ رہی تھی۔ اسماعیلی خاندان عراق یا فلسطین سے آئے تھے خزاعہ یمن کے تھے۔ مکہ والوں کی رشتہ داری اور کاروباری تعلقات شہر مدینہ اور طائف سے بھی کافی تھے، قصیؔ کا تعلق شمالی عرب کے قبیلہ قضاعہ سے تھا۔ قصیؔ کی کوشش اور قابلیت سے قریشی قبائل نے شہر مکہ میں سربرآوردہ حیثیت حاصل کی اور قصیؔ ہی کی سرداری میں ایک زیادہ منضبط شہری مملکت قائم ہوئی جس میں سماجی اور انتظامی عہدے موروثی مختلف خاندانوں میں پائے جاتے تھے، جہاں تک قانون کا تعلق ہے حجاز میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم ہونے کے باعث اسلام سے پہلے کسی تحریری مجموعہ کا پتہ نہیں چلتا لیکن قانونِ معاہدہ اور قانونِ جرائم وغیرہ کے بہت سے رواجی احکام روایات نے محفوظ رکھے حتیٰ کہ اجنبیوں کے حقوق کے تحفظ اور تصادم سے بچنے کے لئے حلف الفضول کے نام سے ایک رضاکارانہ نظام بطور تہدید وتدارک وجود میں آگیا تھا لیکن مکہ کے اس نظام میں چند بنیادی خامیاں تھیں جن کی بنا پر مکہ کی شہری زندگی میں اندر ہی اندر ناراضگی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ مکہ میں ایک طرف سرمایہ دار تاجروں کا ایک مخصوص طبقہ تھا اور دوسری طرف حبشی غلاموں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ مکہ میں سودی کاروبار زوروں پر تھا امیر طبقہ مال میں مست تھا تجارت کے سراتے سے انہیں دولت ملتی اور دولت سے یہ لوگ خدمت کے لئے حبشی غلام خریدتے اور حظِ نفس کے لئے لونڈیاں لاتے، چنانچہ ناچ اور گانے کی محفلیں جمتیں اور شراب کا دور چلتا سفر کے سلسلے میں جب ان لوگوں کا ایران اور شام سے گزر ہوتا تو وہاں سے عیش وعشرت کے نئے نئے انداز سیکھ کر آتے مکہ کا یہ گنا چنا اوپر کا طبقہ اس لہو ولعب میں منہمک تھا لیکن مکہ کے باشندوں کی اکثریت اقتصادی بدحالی کا شکار ہو رہی تھی"

لہذا یہاں حضرت امام سندھیؒ کا مقصد قرآن پاک کے بواسطہ جماعت صحابہ (مہاجرین وانصار) عمومی اثرات کو بیان کرنا ہے چنانچہ بعثت سے سو سال کے عرصہ میں قوم عرب بحیثیت خدام اسلام وانسانیت نہایت احسن طریقے سے ذمہ داری کو پورا کرتے

ہوتے نظر آتی ہے۔ یہی عرب قبائل قیصر و کسریٰ کے فرسودہ نظاموں کو الٹ کر نئے تمدن کی بنیاد رکھتے ہیں ۱۲ (ع ق)

اسی قرآن کی تعلیم نے ان میں نہایت جلد ایسے کامل ترین اخلاق پیدا کر دیئے کہ اگر ایک طرف چند سال کے عرصہ میں دنیا کی سب سے بڑی سلطنتوں نے متفقہ طور سے ان کے سامنے سر اطاعت خم کر دیا تھا تو دوسری طرف وہ سب سے زیادہ خدا پرست بن گئے۔ جنگ قادسیہ کے موقعہ پر جو ۱۵ھ میں ہوئی تھی۔ ایک ایرانی جرنیل نے کہا تھا۔ کہ ہم ان لوگوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے یہ رات کو فرشتے ہوتے ہیں اور دن میں شیر ہیں۔

اس تعلیم کے نتائج ظاہر ہونے سے پیشتر عربوں کی جو حالت تھی۔ اس کا اندازہ ایران کے شہنشاہ یزدجرد کے ان خیالات سے ہو سکتا ہے جس کا اظہار فردوسی نے اس طرح کیا ہے۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار
کہ تخت کیاں را کنند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

اونٹ کا دودھ پینے اور گوہ کھانے سے قوم عرب کا کام اس جگہ پہنچ گیا ہے کہ کیان کے تخت کی آرزو کرنے لگ گئے تجھ پر تف ہے اے آسمان اور تف ہے۔

دنیا میں وہی حکومت کرتے ہیں جن کے اخلاق بہتر ہوتے ہیں۔ قرآن کی تعلیم نے ان اونٹ چرانے والے عربوں کو نہایت جلد ایسے اخلاق سے مزین کر دیا۔ کہ ایران تو ایران رہا وہ تقریباً تمام دنیا کے مالک بن گئے خدا کے احکام کی تعمیل کے لئے وقت اور مال کی تو حقیقت ہی کیا ہے۔ نہایت خوشی سے جان دینا بہترین کامیابی سمجھنے لگے۔ مثلاً دو واقعات پیش کرتا ہوں۔

(۱) عن انس قال بعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خالی حراماً فی سبعین راکبا، فلما قدموا قال لھم خالی۔ اتقدمکم فان امنونی حتی ابلغھم عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ والا کنتم منی قریبا۔ فتقدم فامنوہ۔ فبینما ھو یحدثھم عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی رجل منھم فطعنہ۔ فاومأوا فقال اللہ اکبر فزت برب الکعبۃ۔

ترجمہ:۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ماموں حرام کو ستر سواروں کے ساتھ روانہ کیا، پس پھر وہ پہنچے تو میرے ماموں نے ان سے کہا کہ میں تم سے پہلے جاتا ہوں اور اگر انہوں نے مجھے امان دی کہ میں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچا دوں تو خیر ورنہ تم میری مدد کے لئے قریب ہو جانا۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھے۔ اور انہوں نے ان کو پوری امان دے دی۔ لیکن جس وقت وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچا رہے تھے تو ان لوگوں نے اپنے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا۔ تو اس نے ان کے ایک نیزہ مارا۔ وہ نیزہ ان کے جسم کے پار ہو گیا۔ اس پر میرے ماموں نے کہا۔ اللہ اکبر کعبہ کے رب کی قسم میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

۲۔ حضرت خبیبؓ کا واقعہ بخاری اور ابوداؤد میں مذکور ہے کہ جس وقت آپ کو حارث بن عامر بن نوفل کی اولاد نے شہید

؎ اسی قسم کا ایک واقعہ اشاعت اسلام معروف بہ "دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا" میں مولانا حبیب الرحمان عثمانیؒ نے غالباً تاریخ طبری کے حوالہ سے لکھا ہے، فرماتے ہیں اجنادین ملک شام میں بہت بڑا شہر ہے اس جگہ مسلمانوں اور رومیوں میں بڑا معرکہ ہوا ہرقل کا حقیقی بھائی لشکر روم کا سپہ سالار تھا مسلمانوں کا لشکر یہاں جمع ہو گیا تو سپہ سالار روم نے ایک عربی شخص کو اس غرض کے لئے بھیجا کہ مسلمانوں کے لشکر میں رہ کر ان کی اصلی حالت کی خبر لا دے یہ شخص چونکہ خود عربی تھا مسلمانوں میں آملا اور ایک رات دن رہ کر ان کے شب و روز کے حالات دیکھے، راتوں کو تہجد گزاری اور تلاوت کلام الٰہی کرتے دیکھا ہر شخص کو دیکھا کہ بلا تصنع و تکلف عبادت میں مشغول ہے ایک دوسرے کا باہمی معاملات میں نہایت صفائی سے برتاؤ ہے۔ ہر شخص امیر کے حکم کا دل وجان سے مطیع و فرمانبردار ہے۔ یہ حالات دیکھ کر واپس ہوا۔ سپہ سالار روم نے پوچھا کہو کیا دیکھا اس نے کہا "بالليل رهبان وبالنهار فرسان" ويوسرق ابن ملكهم قطعوه ولوزنى رجم لاقامة الحق فيهم، (یہ لوگ رات کو راہب اور عابد ہیں اور دن میں بہادر شہسوار اگر ان کے بادشاہ کا بیٹا بھی چوری کرے تو ہاتھ کاٹ ڈالیں اور اگر زنا کرے تو رجم کر دیں حق کے جاری کرنے میں کسی کی رعایت نہیں) سپہ سالار نے سن کر کہا ان كنت صدقتني لبطن الارض خير من لقاء هولاء) اگر تو نے سچ بیان کیا ہے تو زمین کے اندر اتر جانا اس سے بہتر ہے کہ ان لوگوں سے مقابلہ کیا جائے، صحابہ کے یہی حالات تھے جن کو دیکھ کر ہر مخالف شخص بھی متاثر اور اسلام کی حقانیت کا قائل ہو جاتا ہے۔

(اشاعت اسلام ص ۸۴، ۸۵ طبع دہلی ۱۹۵۰ء)

کیا تو آپ نے یہ شعر پڑھے۔

وَلَسْتُ اُبَالِی حِیْنَ اُقْتَلُ مُسْلِمًا عَلٰی اَیِّ شِقٍّ کَانَ لِلّٰہِ مَصْرَعِ

وَذٰلِکَ فِیْ ذَاتِ الْاِلٰہِ وَاِنْ یَّشَأْ یُبَارِکْ عَلٰی اَوْصَالِ شِلْوٍ مُمَزَّعِ

ترجمہ :۔ جب کہ میں مسلمان ہونے کی حالت میں قتل کیا جاتا ہوں۔ تو مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ اللہ کے راستے میں کس پہلو پر گرتا ہوں۔ اور یہ اللہ کی راہ میں ہے۔ کہ اگر وہ چاہے تو انہیں جُدا جُدا ہوتے اعضاء کے جوڑوں میں برکت پیدا کر دیگا (ممکن ہے یہی کچھ کام کر جائیں)

عقلمند لوگوں نے اس تعلیم کے ظاہری نتائج پیدا ہونے سے پیشتر ہی اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ کہ یہ تعلیم یقیناً ایسے کامل ترین اخلاق پیدا کرنیوالی ہے۔ کہ جن لوگوں پر اس کا اثر ہو گا۔ خواہ وہ کیسے ہی غیر مہذب اور جاہل کیوں نہ ہوں۔ نہایت جلد دنیا میں بہترین اور قوی ترین بن جائیں گے۔

ہرقل کی دعوت کا واقعہ :۔

چنانچہ سنہ ۶ھ میں جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روم کے بادشاہ ہرقل کو بذریعہ خط و کتابت دعوت اسلام دی تو اس نے ابوسفیان کو جو اتفاقاً اس وقت روم ہی میں تھا۔ بلا کر اسلامی تعلیمات اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات دریافت کئے۔ حالات معلوم ہونے کے بعد ہرقل نے یہ الفاظ کہے۔

اِنْ یَکُ مَا تَقُوْلُ حَقًّا فَاِنَّہٗ نَبِیٌّ وَلَیَبْلُغَنَّ مُلْکُہٗ مَا تَحْتَ قَدَمَیَّ۔

ترجمہ :۔ "جو کچھ تم کہتے ہو اگر یہ سچ ہے تو وہ یقیناً نبی ہے اور اس کی سلطنت ضرور میرے قدموں کے نیچے کی زمین تک پہنچے گی۔

ہرقل کی یہ رائے بالکل صحیح ثابت ہوئی اور یہی تعلیم آج بھی قرآن میں موجود ہے۔ مگر آج ہم نہایت خراب حالت میں ہیں۔ تمام دنیا میں مسلمان نہایت پست اور کمزور ہیں اور ان کی اخلاقی اور روحانی حالت نہایت تیزی سے تنزل (زوال) کر رہی ہے۔ یہ نہایت عجیب اور حیرت انگیز بات ہے اور ہماری اس پست حالت کو دیکھ کر اکثر لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا ہے کہ ان کی مذہبی تعلیم کی بدولت ان کی یہ حالت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اعمال تعلیم ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں چنانچہ اس بارے میں مصر کے اس صدی کے ایک نامور عالم نے لکھا ہے۔

وانما یکون تغیرما بالانفس بالتربیۃ والتعلیم۔ فان المراد من التغیر ما یترتب علیہ تغیر العمل وانما الاعمال اٰثار العلوم والاخلاق۔ فمتٰی کان العلم بالحق والباطل و بالمصالح والمفاسد صحیحا۔ والاخلاق فاضلۃ کانت الاعمال کلھا صالحۃ مودیۃ الی رقی الافراد وکمالھم الدینی والمدینی۔ ولو کان التعلیم الذی جرینا علیہ من عدۃ قرون یخرج لنا رجالا ینھضون بالامۃ الاسلامیۃ ویخرجونھا من حجر

الضب الذی نحن فیہ ظہرت آثارہ ولما بقینا فی ھذہ الحالۃ التی نحن فیہ منذ بضعۃ قرون کانّا مصابون بالفالج او داء السکتۃ۔ [3]

---

[1] ملاحظہ ہو صحیح بخاری کتاب الجہاد باب ھل یستأسر الرجل الخ ج ۱ ص ۴۲۸ طبع نور محمد دہلی ۱۲

[2] بخاری کتاب الجہاد باب دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی الاسلام ج ۱ ص ۴۱۳ طبع مذکور ۱۲

[3] یہ حوالہ معلوم نہیں کس کتاب سے حضرت سندھیؒ نے لیا ہے اور مصری عالم سے کون مراد ہیں ۱۲

ترجمہ:۔ "اور کسی قسم کا تغیر (تبدیلی) تعلیم و تربیت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تغیر (تبدیلی) سے مراد وہ تغیر (تبدیلی) ہے جس کا نتیجہ عمل کا تغیر ہے۔ اور اعمال، علوم اور اخلاق کے آثار ہیں تو پھر جب حق اور باطل اور ——— منافع اور مضار (نقصان دہ) کا علم صحیح ہو گا اور اخلاق عمدہ ہوں گے تو اعمال بھی سب اچھے ہوں گے۔ جو کہ قوم کے افراد کو اعلیٰ ترقی دیں گے اور مذہبی اور تمدنی کمالات تک پہنچا دیں گے اور اگر موجودہ تعلیم جس پر ہم چند صدیوں سے چل رہے ہیں ایسے افراد پیدا کر دیتی جو کہ ملت اسلامی کو ترقی پر پہنچا دیتی اور اسے "گوہ" کے بل سے نکال لیتی جس میں ہم مقید ہیں۔ تو ان کے آثار ظاہر ہوتے تو ہم اس ذلت کی حالت میں نہ رہتے جس میں ہم چند صدیوں سے مقید ہیں۔ گویا ہم فالج یا سکتہ کی بیماری میں مبتلا ہو گئے ہیں۔"

ہم تو مریض ہیں اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ قرآن شریف ذریعہ شفاء اور رحمت ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ۔ (بنی اسرائیل ۸۲، پ۱۵)

ترجمہ:۔ "اور قرآن شریف کو ہم نے مومنوں کے لئے شفاء اور رحمت کر کے بھیجا ہے"

تو پھر ہم شفایاب کیوں نہیں ہوتے؟ ہم مریض کیوں ہیں؟

ہماری مذہبی کتاب کی تعلیم تو ایسی ہے کہ غیر بھی اس کے ظاہری نتائج نکلنے سے پیشتر یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ اس تعلیم سے ایسے نتائج نکلنے والے ہیں کہ اس سے جو متاثر ہوں گے وہ دنیا میں سب سے زیادہ مہذب سب سے زیادہ متمدن کامیاب اور قوی ہوں گے۔ خود وہ کتاب بھی ایسا ہی دعویٰ کرتی ہے۔ علاوہ اس کے نتائج بھی مشاہدے میں آچکے ہیں۔ اس تعلیم کے نتائج کا تجربہ بھی ہو چکا ہے۔ مگر باوجود اس کے کہ یہ تعلیم اب بھی موجود ہے۔ پھر بھی ہم مریض ہیں۔ ہم پست ہیں ہم کمزور ہیں۔

یہ نہایت حیرت انگیز اور عجیب بات ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنا نہایت ضروری ہے اور اس پر ہماری حیات کا انحصار ہے۔ ضرورت ہے کہ اس اہم ترین مسئلہ پر قوم کے بہترین دماغ غور کریں۔ تاکہ صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں۔ اپنی بساط کے مطابق میں نے بھی اس مسئلہ پر غور کیا اور جن نتائج پر پہنچا ہوں پیش کرتا ہوں۔

مریض موجود ہو اور اکسیر موجود ہو۔ مسموم (زہر ملا ہوا) موجود ہو اور تریاق (زہر کی دوا) موجود ہو اور مرض نہ جاتا ہو۔ زہر نہ جاتا ہو تو اس کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ یا تو اکسیر اور تریاق کا استعمال نہیں کیا جاتا یا اگر استعمال کیا جاتا ہے تو غلط طریقہ سے کیا جاتا ہے۔

دوا جب ہی نفع پہنچاتی ہے جب وہ صحیح طریقہ سے استعمال کی جائے۔ اگر غلط اور غیر مناسب طریقہ سے استعمال کی جائے تو وہی زہر بن جاتی ہے۔ جب ایک طرف خدا تعالیٰ قرآن کو ذریعہ شفا فرماتا ہے اور دوسری طرف تجربہ نے بھی اس کو ایسا ہی ثابت کر دیا ہے کہ ایک بدترین قوم کو جو نہایت خراب اور پست حالت میں تھی مشرک بت پرست اور جاہل تھی۔ اس قوم کو چند سال میں بہترین قوم بنا دیا اس کے مہلک ترین امراض کو شفاء دے کر بہترین صحت عطا کر دی۔ اور اگر ہم باوجود اس تعلیم کے بدستور خراب حالت میں ہیں تو یہ لازمی ہے کہ یا تو

ہم اس ذریعہ شفاء کو استعمال نہیں کرتے یا اگر کرتے ہیں تو غلط اور غیر مناسب طریقہ سے استعمال کرتے ہیں۔

غور کرنے سے معلوم ہوا کہ ہماری تباہی کے یہی دو سبب ہیں۔ ہماری قوم کا ایک حصّہ تو قرآن مجید سے بالکل ہی محروم ہے اور دوسرا حصہ اس تریاق کو غلط طریقہ سے استعمال کرتا ہے اور اسی وجہ سے موجودہ خراب نتائج پیدا ہو رہے ہیں۔ قوم کا جو حصّہ قرآن کی تعلیم سے محروم ہے۔ اس کے متعلق کسی قسم کی بحث کی ضرورت نہیں ہے اگر وہ خراب حالت میں ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں جو دوا کو اور صحت کے طریقوں کو استعمال نہ کرے گا وہ خواہ مخواہ مختلف امراض میں گھرا رہے گا۔ اس وقت قوم کے دوسرے حصّے کی حالت پر غور کرنا ضروری ہے جو ایک بہترین تریاق کو غلط طریقہ سے استعمال کر کے اس کے فوائد سے محروم ہو رہا ہے۔

دریا ر دوا ز چشم لب تر نشود ہرگز
ایں طرفہ تماشہ بین لب تشنہ بہ آب اندر

تعلیم قرآن کا صحیح طریقہ

قبل ازیں کہ ہم اس پر غور کریں کہ قوم کا ایک حصہ قرآن کی تعلیم کو کن کن غلط طریقوں سے استعمال کر کے اس کے فوائد سے محروم ہے۔ بہتر ہے کہ ہم یہ دریافت کر لیں کہ قرآن کی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کا صحیح طریقہ کیا ہے اس کے بعد فیصلہ کرنے میں ہمیں آسانی ہوگی۔ جب کوئی طبیب کوئی نسخہ لکھتا ہے تو طریقہ استعمال بھی ضرور بتلا دیتا ہے۔ اسی طرح ضروری ہے کہ قرآن کی تعلیم کا صحیح طریقہ بھی ہمیں قرآن میں ملنا چاہیئے۔ قرآن مجید میں ہے کہ

(۱) وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ○

"اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو"

(۲) اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ۔ (البقرہ ۱۲۱)

"جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو کما حقہ پڑھتے ہیں اور وہی اس پر ایمان لاتے ہیں۔

(۳) وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ (البقرہ ۱۲۱)

"اور جو لوگ اس کا انکار کریں گے وہ نقصان اٹھانیوالے ہیں"

(۴) فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ (الاعراف ۱۷۶) "ان کو قصے سناؤ تاکہ وہ غور کریں"

(۵) كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (یونس ۲۴) "غور کرنیوالوں کیلئے ہم اسطرح ایات تفصیل سے بیان کرتے ہیں"

(۶) وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا (بنی اسرائیل ۱۰۶) "اور قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے اس مصلحت سے اتارا کہ تم وقتاً فوقتاً مہلت کے ساتھ اسے لوگوں کو پڑھ کر سناؤ" اور اسی مصلحت سے ہم نے

اسے رفتہ رفتہ اتارا ہے۔ (۷) لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ کِتَابًا فِیْہِ ذِکْرُکُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (الانبیاء ۱۰) ترجمہ: "(لوگو!) ہم نے تمہاری طرف (یہ قرآن) ایسی کتاب اتاری ہے جس میں تمہارا ذکر ہے کیا تم پھر نہیں سمجھتے" (۸) وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰٓی اِلَیْکَ وَحْیُہٗ (سورہ طٰہٰ ۱۱۴) "اور اے پیغمبر تمہاری طرف جو قرآن وحی کیا جاتا ہے وحی کے تمام ہونے سے پہلے قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو" (۹) وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ۔ (الروم: ۵۸) ترجمہ:" اور ہم نے لوگوں کے سمجھانے کے لیئے اس قرآن میں سب ہی طرح کی مثالیں بیان کر دی ہیں، تاکہ یہ لوگ نصیحت پکڑیں" (۱۰) وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ۔ (القمر ۱۷) ترجمہ: "اور ہم نے قرآن کو لوگوں کے نصیحت پکڑنے کے لیے آسان کر دیا تو کوئی ہے کہ نصیحت پکڑے" (۱۱) اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ (النساء ۸۲) "کیا ان لوگوں نے ہمارے ارشاد یعنی قرآن میں غور نہیں کیا۔" (۱۲) وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْہِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَۃً وَّاحِدَۃً کَذٰلِکَ لِنُثَبِّتَ بِہٖ فُؤَادَکَ وَرَتَّلْنٰہُ تَرْتِیْلًا۔ (الفرقان ۳۲) ترجمہ "اور کافر کہتے ہیں کہ اس پیغمبر کا قرآن سارے کا سارا ایک دم کیوں نہیں نازل کیا گیا ہم کہتے ہیں کہ جیسا وقتاً فوقتاً اترا ہے ایسا ہی اترنا چاہیئے تھا۔"

اور اے پیغمبر اس میں مصلحت ہے کہ ہم وقتاً فوقتاً اس کے ذریعہ سے تمہارے دل کو تسکین دیتے رہیں اور اس وجہ سے ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر اتارا ہے۔ (۱۳) وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْھَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا۔ (الفرقان ۷۳) ترجمہ: "اور نیز وہ لوگ کہ جب ان کو ان کے پروردگار کی آیتیں سنا سنا کر نصیحت کی جائے تو اندھے اور بہرے ہو کر ان پر نہ گریں۔ (۱۴) کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ اِلَیْکَ مُبٰرَکٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِہٖ وَلِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (ص ۲۹) ترجمہ: "اے پیغمبر یہ قرآن بڑی برکت والی کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں" اور جو عقل رکھتے ہیں اس کے مطلب سے نصیحت پکڑیں۔ (۱۵) اِنَّا جَعَلْنٰہُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ (الزخرف: ۳) ترجمہ: "ہم نے اس کو صاف اور سلیس عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ تم اسکو بآسانی سمجھو۔" (۱۶) فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰہُ بِلِسَانِکَ لَعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ (الدخان ۵۸)

پس ہم نے اسکو تیری زبان میں آسان کیا ہے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں،

فَاسْتَمْسِکْ بِالَّذِیْٓ اُوْحِیَ اِلَیْکَ اِنَّکَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ وَاِنَّہٗ لَذِکْرٌ لَّکَ وَلِقَوْمِکَ وَسَوْفَ تُسْئَلُوْنَ

ترجمہ "تو اے پیغمبر قرآن جو تمہاری طرف وحی کیا گیا ہے۔ اس کو خوب مضبوط پکڑے رہو اس میں شک نہیں کہ تم سیدھے راستے پر ہو اور یہ قرآن تمہاری اور تمہاری قوم کے لئے نصیحت ہے اور آگے چل کر تم سب سے اس کی بابت بازپرس ہو گی۔"

(۱۸) اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا (سورہ محمد ۲۴) ترجمہ "کیا یہ لوگ قرآن کے مطالب کو نہیں سوچتے یا دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں" (۱۹) یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُمْ وَیَھْدِیَکُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَیَتُوْبَ عَلَیْکُمْ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ۔ (النساء ۲۶) "اللہ چاہتا ہے کہ (انبیاء اور صلحاء) جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ ان کے طریقے تم سے کھول کھول کر بیان کرے اور تم کو انہیں طریقوں پر چلائے اور تم پر رحم کی نظر رکھے۔ اور اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے۔

(۲۰) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (الاحزاب: ۲۱) ترجمہ:۔ "اور مسلمانو! تمہارے لیے پیروی کرنے کے لیئے رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے۔"

کلام مجید میں جو طریقہ اس کو پڑھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا ہے وہ صاف طور پر ان آیات میں درج ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ ا۔ قر

۱۔ قرآن مجید نہایت غور و خوض سے پڑھو اور سمجھو۔ پوری طرح سے اسمیں فکر کرو۔ تدبر کرو۔

۲۔ جو کچھ پڑھو اس کے مطابق صحیح عمل کرو۔ کیونکہ تمہاری پیدائش کا مقصد عمل ہے۔

(۱) اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ (الملک: ۲)

ترجمہ:۔ "اللہ تعالیٰ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم لوگوں کو آزمائے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے۔"

(۲) يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (النساء: ۲۶)

ترجمہ:۔ "اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ (انبیاء و صلحا) جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کے طریقے تم سے کھول کھول کر بیان کرے اور تمہیں انہی طریقوں پر چلائے۔"

(۳) اور کلام مجید کی تعلیم پر عمل کرنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور نمونہ پیش رکھو۔ کسی تعلیم پر عمل کرنے میں آسانی اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ اس پر عمل کا مجسم نمونہ پیش نظر رہے تاکہ مختلف لوگ مختلف طریقہ عمل استعمال نہ کریں اور افراط و تفریط سے محفوظ رہیں۔ خود قرآن میں قرآن کی تعلیم کا طریقہ بالکل صاف طور پر بتلا دیا گیا ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ اسی طریقہ پر کاربند ہوئے اور پورے کامیاب ہوئے۔

حضور پر نور قرآن مجید پر بے انتہا غور فرماتے تھے۔ بعض وقت صرف ایک آیت کو بار بار تلاوت فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ پوری رات گزر جاتی تھی اور صبح ہو جاتی تھی۔ امام ابن قیم اپنی کتاب زاد المعاد کی پہلی جلد صفحہ ۹۰ پر تحریر فرماتے ہیں۔

وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرتل السورۃ حتی تکون اطول منہا وقام بایۃ حتی الصباح من ایاتہا۔

ترجمہ:۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سورۃ کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے یہاں تک کہ ایک معمولی سورت بڑی سے بڑی سورت ہو جاتی تھی اور بعض دفعہ ایک ہی آیت پر ٹھہر جاتے تھے اور اسی کو بار بار صبح تک پڑھتے رہتے تھے۔"

تعلیم قرآن کے بارے میں صحابہ کرام کی آراء اور تعامل

حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔

ان الترتیل وتدبر مع قلۃ القراۃ افضل من سرعۃ القراۃ مع کثرتہا۔ بان المقصود من القراۃ فہمہ وتدبرہ و التفقہ فیہ والعمل بہ وتلاوتہ وحفظہ وسیلۃ الی معانیہ کما قال بعض السلف نزل القرآن لیعمل بہ فاتخذوا تلاوتہ عملا ولہذا کان اہل القرآن ہم العالمون بہ والعاملون بما فیہ وان لم یحفظوہ عن ظہر قلب واما من حفظہ ولم

يفهمه ولم يعمل به فليس من اهله وان اقام حروفه اقامة السهم واما مجرد التلاوة من غير فهم ولا تدبر ينفعها البر والفاجر والمومن والمنافق كما قال النبي صلى الله عليه وسلم مثل المنافق الذى يقراء القران كمثل الريحانة ريحها طيب وطعمها مر۔

ترجمہ:۔ آہستہ پڑھنا اور غور کرنا جس میں قرآن شریف اگرچہ تھوڑا پڑھا جائے۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ جلدی پڑھا جائے۔ کیونکہ پڑھنے سے مقصود سمجھنا اور غور کرنا ہے تاکہ اس پر عمل ہو سکے اور اس کا پڑھنا اور یاد رکھنا معانی تک پہنچنے کا وسیلہ ہے چنانچہ ایسا ہی بعض سلف نے کہا ہے کہ قرآن شریف اس لئے نازل ہوا ہے تاکہ اس پر عمل کیا جائے مگر انہوں نے اس کی تلاوت کو ایک مستقل عمل بنا لیا۔ اسی لئے گزشتہ طبقات میں اہل قرآن وہی سمجھے جاتے تھے جو قرآن شریف کے عالم اور عامل تھے اگرچہ ان کو زبانی حفظ نہ بھی ہوتا تھا لیکن جس شخص نے قرآن کو یاد کیا اور اس کے مطالب نہ سمجھے نہ ان پر عمل کیا تو وہ اہل قرآن میں سے نہیں ہے۔ اگرچہ اس کے حروف کو تیر کی طرح اس نے درست کر لیا اور مختصر تلاوت جو کہ فہم اور تدبر سے خالی ہو اس کو تو ہر نیک و بد مومن اور منافق کر سکتا ہے۔

چنانچہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ جو منافق قرآن شریف پڑھتا ہے اس کی مثال ریحان کی سی ہے کہ اس کی بو عمدہ ہے اور مزا کڑوا ہے۔

وقال شعبة حدثنا ابو حمرة قال قلت لابن عباس: انى رجل سريع القراة وربما قرات القران فى ليلة مرة او مرتين قال ابن عباس لان اقرا سورة واحدة اعجب الى من ان افعل ذالك الذى تفعل فان كنت فاعلا لابد فاقرا قراة تسمع اذنيك ويعيه قلبك۔

ترجمہ:۔ "شعبہ نے کہا ہے کہ ابو حمزہ نے ہم سے بیان کیا کہ میں نے ابن عباسؓ سے کہا کہ میں تیز پڑھنے والا ہوں۔ بعض اوقات ایک رات میں ایک یا دو مرتبہ قرآن ختم کر لیتا ہوں۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ مجھے اس طرح قرآن پڑھنے سے ایک سورت پڑھنا بہتر معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال اگر تم تیزی سے ہی پڑھنا چاہو تو بھی ایسے پڑھو کہ تمہارے کان سنیں اور تمہارا دل اسے یاد کرے"

قال ابن مسعود: قفوا عند عجائبه وحركوا به القلوب ولا يكن هم احدكم اخر السورة۔

ترجمہ:۔ ابن مسعودؓ نے فرمایا ہے کہ قرآن شریف کے عجائب پر ٹھہرو اور ان سے دلوں میں رقت پیدا کرو اور تمہاری یہ کوشش نہ ہو کہ خواہ مخواہ آخری سورت تک پہنچو"

وقال عبد الرحمن ابن ابى ليلى: دخلت على امراة وانا اقرأ سورة هود۔ فقالت: يا عبد الرحمن هكذا تقرا سورة هود والله انى فيها منذ ستة اشهر وما فرغت من قراتها۔

ترجمہ:۔ "عبدالرحمن بن ابن لیلی نے کہا۔ میں ایک عورت کے ہاں گیا اور میں سورۃ ہود پڑھ رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اے عبدالرحمن تم اس طرح سورۃ ہود پڑھتے ہو خدا کی قسم میں چھ مہینے سے سورۃ ہود پڑھ رہی ہوں اور اب تک اس سے فارغ نہیں ہوئی"

حضرات صحابہ کرام ایک طرف تو قرآن مجید پر اس قدر غور کرتے تھے اور دوسری طرف اس پر پورا عمل فرماتے تھے قرآن شریف کو اس طرح پڑھتے تھے کہ پہلے دس آیتیں پڑھیں اور ان پر عمل کیا پھر اس کے بعد دس آیتیں پڑھیں

اوران پر عمل کیا پھر اس کے بعد دس آیتیں پڑھیں ان پر عمل کیا اور پھر اس کے بعد دس آیتیں پڑھتے تھے اور ان پر عمل کرتے تھے فقط پڑھنے اور سمجھنے کو ہی مقصود نہیں بنایا تھا۔ چنانچہ تفسیر ابن کثیر (پہلی جلد ۵ میں درج ہے)

قال الاعمش عن ابی وائل عن ابن مسعود قال کان الرجل منا اذا تعلم عشر ایات لم یجاوزھن حتی یعرف معانیھن والعمل بھن۔

ترجمہ:۔ "اعمش نے ابن وائل سے روایت کی ہے اور وہ ابن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص ہم میں سے دس آیتیں سیکھ لیتا تھا تو اس سے زیادہ نہ پڑھتا تھا اور جب تک ان کے معانی سمجھ نہ لیتا ان پر عمل نہ کرتا۔"

قال ابو عبد الرحمٰن السلمی حدثنا الذین کانوا یقرؤننا انھم کانوا یستقرؤن من النبی صلی اللہ علیہ وسلم وکانوا اذا تعلموا عشر ایات لم یجاوزوا منھا حتی یعلموا بما فیھا من العمل فتعلمنا القرآن والعمل جمیعا۔

ترجمہ:۔ ابو عبد الرحمٰن سلمی نے فرمایا ہے کہ ہم سے ان لوگوں نے بیان کیا ہے جو ہم کو پڑھاتے تھے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا کرتے تھے اور جس وقت دس آیتیں پڑھ لیتے تھے تو ان سے تجاوز نہ کرتے تھے۔ جب تک کہ ان پر عمل نہ کرتے تھے۔ لہٰذا ہم نے قرآن اور اس پر عمل دونوں اکٹھے سیکھے تھے۔"

اس کے ساتھ ہی حضرات صحابہ کرام اس پر غور کرتے تھے۔ کہ قرآن کی تعلیم سے پہلے ان کی حالت کیا تھی اور اس تعلیم کے اثر سے ان کی حالت کیا ہو گئی؟ اپنی حالتوں کا موازنہ کرتے تھے اور قرآن کریم کی تعلیم سے جو اثرات ان پر ہوتے تھے۔ ان کا پورا اندازہ کر لیتے تھے۔ چنانچہ سیرت ابن ہشام جلد اول ص ۱۱۶ میں درج ہے کہ جب حبش کے بادشاہ نجاشی نے حضرت جعفر بن ابی طالب کو دربار میں بلایا اور ان سے اسلامی تعلیم کے بارے میں دریافت کیا اور کہا کہ تم نے اپنے مذہب کو چھوڑ کر کیوں اسلام اختیار کیا ہے تو آپ نے فرمایا:

ایھا الملک کنا قوما اھل جاھلیہ نعبد الاصنام و ناکل المیتۃ و ناتی الفواحش و نقطع الارحام نجور الجور و یاکل القوی من الضعیف فکنا علی ذالک۔

ترجمہ:۔ اے بادشاہ ہم جاہل تھے اور بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے۔ مردار کھاتے تھے اور بے حیائی کے کام کیا کرتے تھے قطع رحمی کیا کرتے تھے اور ہمسائیوں سے برائی کرتے تھے اور ہم میں سے قوی ضعیف کو کھا جاتا تھا ہم اس حالت میں تھے۔"

حتی بعث اللہ الینا رسولا منا نعرف نسبہ و امانتہ، و عفافہ فدعانا الی اللہ لنوحدہ و نعبدہ و نخلع ماکنا نعبد و اباءنا من دونہ من الحجارۃ و الاوثان و امرنا بصدق الحدیث و اداء الامانۃ و صلۃ الرحم وحسن الجوار و الکف عن المحارم و الدماء و نھانا من الفواحش و قول الزور و اکل مال الیتیم و قذف المحصنۃ و امرنا ان نعبد اللہ وحدہ و لا نشرک بہ شیأ و امرنا بالصلوۃ و الزکوۃ و الصیام فعدد علیہ امور الاسلام فصدقناہ و امنا بہ و اتبعناہ علی ماجاء بہ من اللہ نعبد اللہ وحدہ ولا نشرک بہ شیأ و حرمنا و حرم علینا و احللنا ما احل لنا فعدا علینا قومنا فعذبونا و فتنونا علی دین لیردونا الی عبادۃ الاوثان من عبادۃ اللہ تعالیٰ۔

ترجمہ :۔ "کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف رسول بھیجا۔ جس کے نسب، امانت اور پاک دامنی سے ہم خوب واقف ہیں۔ اس نے ہمیں توحید کی دعوت دی تاکہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں اور ہم اور ہمارے آبائے پہلے جن بتوں اور پتھروں کی عبادت کیا کرتے تھے۔ ان کو چھوڑ دیں اور اس نے ہمیں سچ بولنے اور امانت ادا کرنے اور صلہ رحمی کرنے اور ہمسائیوں کے ساتھ نیکی کرنے اور محرمات اور خون ریزی سے بچنے کا حکم دیا اور جھوٹی باتوں اور یتیموں کا مال کھانے اور عفیف عورتوں کو تہمت لگانے سے منع کیا اور اس کا حکم دیا کہ ایک ہی خدا کی پرستش کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ہمیں نماز اور زکوٰۃ اور روزے کا حکم دیا۔ حضرت جعفر بن ابی طالب نے سب اسلامی کام نجاشی کو گن کر سنائے اور اس کے بعد کہا کہ ہم اس نبی کی تصدیق کی اور اس پر ایمان لائے اور جو کچھ وہ خدا کی طرف سے لایا ہے۔ ہم نے سب کو تسلیم کیا۔ اس لئے ہم صرف ایک ہی خدا کی عبادت کرتے ہیں اور کسی کو اس کا شریک نہیں بناتے جو چیز اس نے حرام کی ہے اس کو حرام سمجھتے ہیں اس پر ہماری قوم ہماری دشمن بن گئی اور اس نے ہمیں عذاب دیا اور دین کی وجہ سے تکلیفیں دیں تاکہ ہمیں خدا کی عبادت سے بتوں کی عبادت کی طرف پلٹ دیں۔"

قرآن کی تعلیم کا طریقہ خود قرآن شریف سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے عمل سے بالکل واضح ہے اب آپ ہی فیصلہ فرمائیں کہ ہم کسقدر اس طریقہ تعلیم کے مطابق قرآن سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اب اگر وہی نتائج پیدا نہیں ہوتے تو کیا تعجب کی بات ہے۔ اگر وہ نتائج آپ چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ اسی طریقہ سے قرآن مجید سے فائدہ اٹھائیں ہماری نجات اسی طریقہ پر منحصر ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بالکل صحیح فرمایا۔

لا یصلح اٰخر ھذہ الامۃ الا بما صلح اولھا۔

ترجمہ :۔ "اس اُمت کے آخری حصہ کی اصلاح فقط اسی چیز سے ہو گی جس سے اول کی ہوئی"

اب ہمیں اس پر غور کرنا ہے کہ اس صحیح طریقہ کے چھوڑنے سے قرآن کی اصلی تعلیم میں کون سے نقص پیدا ہو گئے ہیں تاکہ ان کی تلافی کرنے میں خاص طور سے سعی کی جائے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو گا کہ غلط طریقہ تعلیم سے ہم قرآن کے صحیح مطالب سے کسقدر دور ہو گئے ہیں۔

ایک حصہ قوم کا تو قرآن پڑھتا ہی نہیں بالکل محروم ہے۔ لہٰذا اس کو اس تعلیم سے بُعد ہے اور اس طبقہ کے بارے میں کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ دوسرا طبقہ جو اپنے آپ کو قرآن کی طرف متوجہ سمجھتا ہے وہ بھی قرآن سے صحیح طریقے پر مستفید نہ ہونے کی وجہ سے اس کے صحیح مطالب سے دور ہو چکا ہے اور دور ہوتا جاتا ہے۔ اس طبقے میں سے ایک حصہ تو قرآن کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ بلکہ نقل الفاظ کو ہی کافی سمجھتا ہے۔ چنانچہ ہمارے اکثر مکاتب میں یہی رنگ ہے۔ اس طبقے کا دوسرا حصہ اگرچہ قرآن شریف کے مطالب سمجھنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن افسوس ہے کہ وہ ان کے سمجھنے کے مقدمات ہی میں اُلجھا رہتا ہے۔ اور قرآن شریف پر غور کرنے کی طرف نہ تو توجہ کرتا ہے اور نہ اسے اس کا وقت ہی مل سکتا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ جو علمائے ہند کے امام ہیں اپنی نادر کتاب تفہیمات الٰہیہ جلد اوّل طبع شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد میں اسی طبقے کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

قرآن کے غلط طریقہ تعلیم کے نتائج اور شاہ ولی اللہ کی رائے

واقول لطلبۃ العلم : ایھا السفھاؤ المستون انفسکم بالعلماء اشتغلتم بالعلوم الیونانین وبالصرف والنحو وظننتم ان ھذا ھو العلم۔

ترجمہ: "اور میں طالب علموں سے کہتا ہوں کہ اے بیوقوفو! جو خود کو علماء کا خطاب دیتے ہو۔ تم یونانیوں کے علوم میں مشغول ہو گئے ہو اور صرف اور نحو میں پھنس گئے ہو اور تمہارا خیال یہ ہے کہ یہ حقیقی علم ہے"
اس کے بعد ایک موقعہ پر ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن مجید سمجھنے کیلئے جن مقدمات کی ضرورت ہے ان کو بقدر ضرورت سیکھا جائے نہ کہ ان کو مستقل درجہ دے دیا جائے۔

ان لا تشتغلوا بالعلوم الالیۃ الا بانھا آلۃ لا بانھا امور مستقلۃ ۔ (ایضاً)

ترجمہ: "علوم آلیہ میں شغل محض آلہ ہونے کی حیثیت سے کیا جائے نہ کہ اس لحاظ سے کہ وہ مقصود بالذات ہیں"
اور چونکہ یہ طبقہ صرف، نحو، منطق، کلام، معانی اور بدیع وغیرہ میں تکمیل فنون کے لیئے تقریباً تمام وقت صرف کر دیتا ہے اس لیئے اصل قرآن کی طرف توجہ کرنے کا موقع ہی اس کو نہیں ملتا۔ اور جسقدر قلیل اقل حصہ اپنی تعلیم کے زمانہ کا قرآن شریف میں صرف کرتا ہے وہ بھی مفسرین کے مختلف خیالات معلوم کرنے میں صرف کر دیتا ہے۔ یہ رنگ ہمارے عربی مدارس میں پایا جاتا ہے۔ نہایت افسوس ہے کہ آج خالص قرآن کی تعلیم ہی کہیں نہیں دی جاتی جو لوگ سمجھتے ہیں اور اور کہتے ہیں کہ قرآن کی تعلیم ہوتی ہے حقیقت میں وہ قرآن کی تعلیم نہیں ہوتی بلکہ تفسیر قرآن کی تعلیم ہوتی ہے۔ دراصل قرآن کی تعلیم اور تفسیر قرآن کی تعلیم علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ایک چیز نہیں۔ قرآن خود ایک مستقل کتاب ہے اور صاف سلیس عربی میں ہے خدا تعالیٰ قرآن کے بارے میں فرماتا ہے۔

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۔ (الدخان : ۵۸)

ترجمہ "ہم نے اس کو تیری زبان میں آسان کیا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں"

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۔ (القمر : ۱۷)

ترجمہ "اور ہم نے قرآن کو لوگوں کی نصیحت پکڑنے کے لیئے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے کہ نصیحت پکڑے"

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۔ (الزمر : ۲۸)

ترجمہ: "یہ قرآن صاف سلیس عربی زبان میں ہے اس میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں تاکہ اس کو سمجھ کر خدا سے ڈریں۔"

قرآن اور تفسیر کے متعلق شاہ اسماعیل شہید کی رائے

جو شخص عربی جانتے ہوں وہ اسکو کچھ سمجھ سکتے ہیں اور اگر ساتھ ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ پیش نظر رکھیں جس کا حکم خود قرآن میں ہے اور جو صحیح احادیث کے ذریعہ سے بالکل محفوظ ہے تو انہیں کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں ہے اور وہ بالکل صحیح طور پر قرآن شریف کو سمجھ سکتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کر سکتے ہیں اور جو لوگ عربی نہیں جانتے ان کے لیئے بہترین ترجمے موجود ہیں۔ وہ ان کے ذریعہ سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن کسقدر افسوس کی بات ہے کہ لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ ہم قرآن نہیں سمجھ سکتے اس کے سمجھنے کے لیئے بہت سے علوم وفنون کے حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور بڑے عالم ہونے کی ضرورت ہے چنانچہ اسماعیل صاحب شہیدؒ نے کتاب تقویۃ الایمان ص ۲۹، ۳۰ مطبوعہ مکتبہ نحویہ سہارنپور) خیال کی طرف اشارہ فرمایا ہے

اس زمانہ میں دین کی بابت میں جو لوگ کئی راہیں چلتے ہیں کوئی پہلوں کی رسموں کو پکڑتے ہیں۔ کوئی قصے بزرگوں کے دیکھتے ہیں اور کوئی مولویوں کی باتوں کو جو انہوں نے اپنے ذہن کی تیزی سے نکالی ہیں سند پکڑتے ہیں اور یہ عوام الناس میں مشہور ہے کہ اللہ رسول کا کلام سمجھنا بہت مشکل ہے اس کے لیئے بڑا علم چاہیئے۔ ہم کو وہ طاقت کہاں ہے کہ ان کا کلام سمجھیں اور اس راہ پر چلنا بزرگوں کا کام ہے۔ سو ہماری کیا طاقت ہے کہ اس کے موافق چلیں بلکہ ہم کو یہی (بات) باتیں کفایت کرتی ہیں ؛ سو یہ بات بہت غلط ہے۔ اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ قرآن شریف میں باتیں بہت صاف وصریح ہیں۔ ان کا سمجھنا مشکل نہیں اور اللہ و رسولؐ کے کلام کو سمجھنے کے لیلے بہت علم نہیں چاہیئے کہ پیغمبر تو نادانوں کو راہ بتانے کو اور جاہلوں کو سمجھانے کو اور بے علموں کو علم سکھانے کو آئے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورہ جمعہ میں فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔ (الجمعہ : ۲)

ترجمہ: "وہ (خدا) ہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی میں سے پیغمبر بنا کر بھیجا۔ وہ ان کو خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں مبتلا تھے"

سو جو کوئی یہ آیت سنکر یہ کہنے لگے کہ پیغمبر کی بات سوائے عالموں کے کوئی سمجھ نہیں سکتا اور ان کی راہ پر سوائے بزرگوں کے اور کوئی نہیں چل سکتا سو اس نے اس آیت کا انکار کیا۔ اس بات کی مثال یہ ہے کہ جیسے بڑا حکیم ہو اور ایک بہت بیمار۔ پھر کوئی شخص اس بیمار سے کہے کہ فلاں حکیم کے پاس جانا اور اس سے علاج کروانا اور بیمار کہے یہ تو بڑے بڑے تندرستوں کا کام ہے مجھ سے یہ کیوں کر ہو سکتا ہے میں تو بیمار ہوں۔ سو وہ بیمار احمق ہے اور اس حکیم کی حکمت سے انکار کرتا ہے۔ اس واسطے کہ حکیم تو بیماروں ہی کے علاج کے واسطے ہے اور تندرستوں کا علاج کرے اور انہیں کو

اس کی دوا سے فائدہ ہو اور بیماریوں کو کچھ فائدہ نہ ہو۔ تو وہ حکیم کاہے کا۔

افسوس ہم یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن تو ہم سمجھ نہیں سکتے۔ البتہ مختلف حضرات نے (اپنے اپنے خیالات کے لحاظ سے) جو شرحیں (تفسیریں) قرآن کریم کی لکھی ہیں وہ ہم سمجھ سکتے ہیں اور انہیں کو سمجھنا اور ان شرحوں کو سمجھنے کی کوشش کو لوگوں نے قرآن کی تعلیم سمجھ رکھا ہے اگر یہ شرحیں اور تفاسیر ایسی ہوتیں کہ فقط قرآن مجید کا صحیح مطلب ادا کرتیں تو اس میں کوئی نقصان نہ ہوتا۔ لیکن غضب تو یہ ہے کہ مختلف لوگوں نے مختلف زمانوں میں ماحول کے مختلف اثرات سے متاثر ہو کر جو طرح طرح کی باتیں اپنی شرحوں اور تفاسیر میں ایسی درج کی ہیں کہ ان میں اور قرآن میں کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ لوگ ان باتوں کو قرآن کی تعلیم سمجھنے لگے ہیں اور حقیقت میں وہ قرآن کی تعلیم سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔

دوسرا باب

مختصر تاریخ تفسیر

یہ بات واضح کرنا ضروری ہے اور اسی لئے قرآن کی شرحوں کا ابتدائی اور انتہائی مختصر خاکہ بطور نمونہ پیش کرتا ہوں شروع میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ کے زمانہ میں قرآن مجید کے لیئے کسی خاص شرح کے لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ قرآن مجید عربوں کی مادری زبان میں تھا۔ اس کو وہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔ البتہ جب مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور کثرت سے عجمی لوگ مسلمان ہونا شروع ہوئے تو چونکہ ان کی مادری زبان عربی نہ تھی اس لیئے انہیں قرآن سمجھنے میں وقت شروع ہوئی اس وقت کے رفع کرنے کے لئے جہاں جہاں قرآن مجید کی عبارت میں عجمیوں کے لیئے اشکال سمجھے گئے ان کے مطالب کو دوسرے ایسے الفاظ اور جملوں کے ذریعے سے واضح کیا جانے لگا۔ جن کو نسبتاً آسانی سے سمجھا جا سکے۔

صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں ان تفسیری جملوں اور فقروں کو کسی کتاب کی شکل میں لکھنے کے مطلق ضرورت نہیں سمجھی گئی بلکہ جو حضرات قرآن مجید کی تعلیم دیتے تھے وہ تعلیم دینے کے وقت جہاں ضرورت ہوتی تھی ایسے الفاظ اور فقرے استعمال کرتے تھے۔ حضرت عثمانؓ تک کے زمانے میں ان تفسیری الفاظ اور جملوں کی زیادہ ضرورت ہوئی تھی۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت عثمانؓ سے ایسے تفسیری جملے صرف چند مروی ہیں۔ صاحب کشف الظنون جلد اص ۴۲۹ مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ تہران، میں لکھتے ہیں۔

والروایۃ عن الثلثۃ فی ندرۃ جدا۔

ترجمہ: "ان تینوں سے بہت ہی تھوڑی روایت ہے۔"

سب سے زیادہ تفسیری جملے صحابہ میں سے حضرت ابن عباس سے مروی ہے کیونکہ آپ چھوٹے صحابہؓ میں سے تھے اور آپ کی وفات ۶۸ھ میں ہوئی ہے اور اس عرصہ میں کثرت سے عجمی لوگ مسلمان ہو چکے تھے اور بوجہ عجمی ہونے کے ان کو ایسے تفسیری جملوں اور الفاظ کی زیادہ ضرورت تھی۔ لیکن بہت افسوس ہے کہ بہت سے جھوٹے راویوں نے اپنی طرف سے تفسیری فقرے اور جملے بنا کر حضرت ابن عباس کی طرف منسوب کر دیئے ہیں۔

صحابہؓ کرام کے بعد تابعین نے قرآن شریف پڑھانا شروع کیا اور اس تعلیم کے دو مرکز ہو گئے۔ ایک مکہ اور دوسرا کوفہ مکہ میں حضرت ابن عباس کے شاگرد مثلاً مجاہد اور سعید بن جبیر، عکرمہ، طاؤس بن کیسان، عطاء بن ابی رباح قرآن کی تعلیم خصوصیت سے دیتے تھے اور کوفہ میں حضرت ابن مسعودؓ کے شاگرد مثلاً علقمہ بن قیس۔ اسود بن یزید ابراہیم نخعی اور شعبی وغیرہ۔

حضرات تابعین کے زمانہ میں بھی قرآن مجید کے مطالب سمجھانے والے تفسیری الفاظ اور فقروں کو لکھوانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ بلکہ قرآن کی تعلیم کے وقت وہ استعمال کئے جاتے تھے۔

حضرات تابعین کے بعد ان کے شاگردوں نے صحابہؓ اور تابعین کے ان تفسیری الفاظ اور فقروں کو لکھنا شروع کر دیا۔ جن حضرات نے خصوصیت سے یہ الفاظ اور فقرے جمع کئے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ سفیان بن عیینہ و یکع بن الجراح شعبہ یزید بن ہارون، عبدالرزاق ابن ابی ایاس۔ اسحاق بن راہویہ۔ روح بن عبادہ، عبد بن حمید، ابی بکر بن ابی شیبہ۔

اگر یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہتا تو نہایت مفید ہوتا اور آج قرآن کی اصلی تعلیم صحیح رنگ میں جاری رہتی، لیکن افسوس ہے کہ اس طبقے کے بعد ایسے حضرات پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی شرحوں میں قرآن مجید کے صحیح مطالب کو پوری طرح پیش نظر نہیں رکھا بلکہ بہت سی غیر صحیح باتیں بھی اپنی شرحوں میں درج کر دیں اور مختلف تفسیروں کی کتابیں ایسی لکھی شروع کیں، جن میں قرآن کے کچھ حصے کے صحیح اور کچھ حصے کے غیر صحیح مطالب موجود تھے۔

ان کے بارے میں صاحب کشف الظنون جلد نمبر ۱ ص ۳۱ ج میں تحریر فرماتے ہیں۔

ثم الف فی التفسیر طائفة من المتاخرین فاختصروا الاسانید و نقلوا الاقوال فدخل بتراء من ههنا الدخیل والتبس الصحیح بالعلیل ثم صار کل من سنح له قول یورادہ ومن خطر بباله شی یعتمدہ ثم ینقل ذالک خلف عن سلف ظانا أن له اصلا غیر ملتفت الی تحریر ماوردہ عن السلف الصالح۔

"اس کے بعد متاخرین میں سے ایک جماعت نے تفسیریں تالیف کیں اور اسنادوں کو مختصر کر دیا اور بہت سے اقوال نقل کر دیئے یہاں سے زائد باتیں داخل ہونے لگیں۔ اور صحیح اور ضعیف آپس میں ملتبس ہو گئے اس کے بعد جس کسی کو کوئی بات معلوم ہوئی وہی درج کر دی اور جو کچھ اس کے خیال میں آیا۔ اسی پر اعتماد کر لیا اس کے بعد ہر ایک پچھلا طبقہ اپنے متقدمین سے نقل کرنے لگا۔ اس خیال سے کہ کوئی نہ کوئی ضرور اس کی اصلیت ہوگی اور انہوں نے اس کی تحقیق نہیں کی کہ سلف صالحین سے اس میں کیا منقول ہے۔"

ان تفسیروں میں کلام مجید کے الفاظ کے جس حد تک غیر صحیح معنی درج ہونے لگے۔ اس کا اندازہ علامہ سیوطی کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے۔

رائیت فی تفسیر قوله تعالیٰ غیر المغضوب علیهم ولا الضالین نحو عشرة اقوال مع ان الموارد عن النبی صلی الله علیه وسلم وجمیع اصحابة والتابعین لیس غیر الیهود والنصاری۔ کشف الظنون

ترجمہ "میں نے غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کی تفسیر میں دس مختلف قول دیکھے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ اور سب صحابہ کرام اور تابعین سے یہود نصاریٰ کے سوا اور کچھ مروی نہیں ہے۔"

مفسرین کے اس طبقہ کے بعد ایک دوسرا طبقہ پیدا ہوا۔ جنہوں نے اپنی کتابوں میں قرآن مجید کے غیر صحیح مطالب ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے قرآن مجید کے مطالب کو صرف اس فن میں محصور کرنے کی کوشش کی جس کو وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ مثلاً جس کو نحو اچھی طرح آتی تھی۔ اس نے اپنی تفسیر میں کلام مجید کے صحیح مطالب کو پیش کرنے کی جگہ ساری قوت قرآن کی آیتوں کے نحوی نکات بیان کرنے اور ان پر بحث کرنے اور نحو کے مسائل نقل کرنے میں صرف کر دی اور اسی طرح ان تفاسیر کا پڑھنے والا صرف یہ سمجھ سکتا ہے کہ گویا قرآن شریف صرف علم نحو ہی کی تعلیم کی غرض سے نازل ہوا ہے۔ مثلاً اس قسم کی ایک تفسیر میں بجائے اس کے کہ بسم اللہ کا صاف مطلب ظاہر کر دیا جاتا اس کے پڑھنے کی تین ہزار ترکیبیں درج کر دی ہیں۔ اس بارے میں بجائے اس کے کہ میں کچھ کہوں بہتر معلوم ہوتا ہے کہ کشف الظنون کی حسب ذیل عبارت نقل کردوں۔ یہ عبارت اس بات کو واضح کر دے گی۔ کشف الظنون جلد ا ص ۴۳۱، ۴۳۲۔

ثم صنف بعد ذٰلك قوم برعوا فی شی من العلوم و (منهم من) ملأ كتابه بما غلب علی طبعه من الفن واقتصر فيه علی ما تمهر فيه كان القرآن انزل لاجل هٰذا العلم لاغير مع ان فيه تبيان كل شی فالنحوی تراه ليس له هم الاعراب وتكثير الاوجه المحتملة فيه وان كانت بعيدة وينقل قواعد النحو ومسائله وفروعه وخلافيانه كالزجاج والواحدی فی البسيط وابی حيان فی البحر والنهر. والاخباری ليس له شغل الا القصص واستيفاؤها والاخبار عمن سلف سواء كانت صحيحة او باطلة ومنهم الثعلبی والفقيه يكاد يسرد فيه الفقه جميعا وربما استطرد الی اقامة ادلة الفروع الفقهية التی لاتعلق لها بالآية اصلا والجواب عن ادلة المخالفين كالقرطبی وصاحب العلوم العقلية خصوصا الامام فخر الدين (الرازی) قد ملاء تفسيره باقوال الحكماء والفلاسفة وخرج من شئ الی شئ حتی يقضی الناظر العجب. قال ابوحيان فی البحر جمع الامام الرازی فی تفسيره اشياء كثيرة طويلة لاحاجة بها فی علم التفسير ولذلك قال بعض العلماء فيه كل شئ الا التفسير والمبتدع ليس له قصد الا تحريف الآيات وتسويتها علی مذهبه الفاسد بحيث انه لولاح له شاردة من بعيد اقتنصها اووجد موضعا له فيه ادنی مجال سارع اليه كما نقل عن البلقينی انه قال استخرجت من الكشاف اعتزالا بالمناقيش منها انه قال فی قوله سبحانه وتعالی فمن زحزح عن النار وادخل الجنة فقد فاز ای فوز اعظم من دخول الجنة اشار به الی عدم الرؤية. والملحد فلا تسأل عن كفره والحاده فی آيات الله تعالی وافترائه علی الله تعالی مالم يقله كقول بعضهم ان هی الافتنتك ما علی العباد اضر من ربهم وينسب هٰذا القول الی صاحب قوت القلوب ابی طالب المكی. ومن ذٰلك القيل الذين يتكلمون فی القرآن بلاسند ولانقل عن السلف ولارعاية للاصول الشرعية والقواعد العربية كتفسير محمود ابن حمزة الكرمانی فی مجلدين سماه العجائب والغرائب ضمنه اقوالا هی عجائب عند العوام وغرائب عما عهد عن السلف

بل ھی اقوال منکرۃ لا یحل الاعتقاد علیھا ولا ذکرھا الا للتحذیر من ذٰلك قول من قال فی ربنا ولا تحملنا مالا طاقة لنا به انه الحب والعشق ومن ذٰلك قولھم فی ومن شر غاسق اذا وقب انه الذکر اذا قام وقولھم فی من ذا الذی یشفع عندہٗ معناہ من ذل ای من الذل وذی اشارۃ الی النفس ویشف من الشفاء جواب من وع امر من الوعی۔ وسئل البلقینی عمن فسر بھٰذا افأفتی بانه ملحد۔ واما کلام الصوفیة فی القرآن فلیس بتفسیر قال ابن الصلاح فی فتاواہ وجدت عن الامام الواحدی انه قال صنف السلمی حقائق التفسیر ان کان قد اعتقد ان ذٰلك تفسیر فقد کفر۔ قال النسفی فی عقائدہ النصوص تحمل علی ظواھرھا والعدول عنھا الی معان یدعیھا اھل الباطن الحاد۔

ترجمہ:۔ اس کے بعد ایسے لوگوں نے تصنیف کی جنہوں نے کسی ایک علم میں قوت حاصل کی ہے اور اپنی کتاب کو اسی فن سے بھر دیا ہے جو اس کی طبیعت میں غالب تھا اور محض اسی پر اکتفا کیا جس میں کہ اسے مہارت حاصل تھی۔ گویا کہ قرآن شریف محض اسی علم کے لیئے نازل ہوا تھا۔ باوجود یہ کہ اس میں ہر چیز کا بیان موجود ہے۔ نحوی کو فقط اعراب اور وجوہ ترکیب ہی مدنظر رہتے ہیں۔ اگرچہ وہ بعید ہی کیوں نہ ہو اور وہ نحو کے قواعد اور مسائل اور فروع اور خلافیات ہی کو داخل کریگا جس طرح کہ زجاج اور واحدی نے بسیط اور ابوحیان نے بحر اور نہر میں کیا ہے اور اخباری کو محض قصے اور ان کی تکمیل ہی مدنظر رہتی ہے۔ گزشتہ قصے خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط۔ ثعلبی بھی ایسے حضرات ہی میں سے ہیں اور فقیہ کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ ساری فقہ داخل کر دے۔ بسا اوقات فقیہ فروعات فقہ کی دلیلیں لے آتا ہے۔ حالانکہ ان کو نفس آیات کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اور پھر ان دلیلوں کے مخالفین کے جوابات بھی نقل کر دیتا ہے۔ ایسے حضرات میں قرطبی ہیں اور صاحب علوم عقلیہ خصوصًا امام رازی جنہوں نے اپنی تفسیر کو حکماء اور فلاسفروں کے اقوال سے بھر دیا ہے اور کہاں سے کہاں تک چلے جاتے ہیں جس کے دیکھنے والا متعجب ہو جاتا ہے۔ ابوحیان نے بحر میں کہا ہے کہ امام رازی نے اپنی تفسیر میں بہت سی چیزیں ایسی درج کی ہیں۔ جن کی علم تفسیر میں کچھ ضرورت نہ تھی۔ اس لیئے بعض علماء نے فرمایا ہے کہ امام رازی کی تفسیر میں سب کچھ ہے مگر تفسیر نہیں اور ایک بدعتی کی غرض محض آیتوں کی تحریف ہی ہوتی ہے تاکہ ان کو اپنے فاسد مذہب پر منطبق کرے۔ یہاں تک کہ اگر اس کو کوئی دور کی بات بھی سوجھتی ہے تو اسے لے لیتا ہے۔ یا اگر کوئی ایسا موقعہ پاتا ہے جس میں اس کی بات کچھ بھی بن سکے تو فورًا بنا لیتا ہے۔ اور ملحد کا تو ذکر ہی کیا ہے کہ وہ خدا کی نسبت جھوٹ بناتا ہے۔ جو خدا تعالیٰ نے مطلقًا نہیں فرمایا اور جو لوگ قرآن شریف میں بلا سند یا سلف صالحین کے اقوال کے ماسوا اور قواعد عربیہ اور اصول شرعیہ کی رعایت کے بغیر کچھ کہتے ہیں۔ وہ سب اسی قسم میں سے ہیں محمود بن حمزہ کرمانی کی تفسیر دو جلدوں میں اسی قسم کی ہے۔ جس کا نام اس نے "العجائب والغرائب" رکھا ہے۔ اس میں بہت سے قول نقل کئے ہیں۔ جو عوام کے نزدیک عجیب ہیں اور سلف کے طریقے سے بہت دور ہیں بلکہ وہ ایسے ہیں کہ ان پر اعتقاد ہی نا جائز

ہے اور ان کا ذکر کرنا سوائے تحدید کے ناجائز ہے۔ بلقینی سے ایسے لوگوں کے نسبت فتویٰ پوچھا گیا۔ انہوں نے کہا کہ ایسے لوگ (مفسر) ملحدین اور قرآن شریف کے بارے میں صوفیہ کا کلام تفسیر نہیں ہے۔ ابن الصلاح نے اپنے فتاویٰ میں ذکر کیا ہے۔ کہ میں نے امام واحدی سے معلوم کیا ہے انہوں نے فرمایا کہ سلمی نے "حقائق التفسیر" تصنیف کی ہے۔ جو شخص یہ خیال کرے کہ یہ تفسیر ہے تو وہ کافر ہے۔

نسفی نے اپنے عقائد میں کہا ہے کہ نصوص کو اپنے ظواہر پر محمول کیا جائے گا اور ان سے اہل باطن کے معانی کی طرف پھیرنا الحاد ہے۔"

ہم میں یہ رنگ چھٹی صدی میں آ گیا تھا۔ اس کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ قرآن مجید کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ خود ان تفسیروں کی شرحیں اور حاشیے لکھے جانے شروع ہو گئے۔ صرف "تفسیر بیضاوی" کا ملا عوض نے تیس جلدوں میں حاشیہ لکھا ہے۔

نوٹ:۔ یہاں میرا مقصد حضرات علماء پر اعتراض کرنیکا نہیں ہے بلکہ ایک نہایت اہم مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اقتباسات نقل کرتا ہوں۔ حضرات علمائے کرام نے اپنے مذہب کی خدمت جس خلوص اور جانفشانی سے کی ہے اس کی جزا صرف اللہ تعالیٰ ہی مرحمت فرما سکتا ہے۔

صحیح انداز پر تعلیم قرآن سے محرومی کے نتائج

یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ اصل قرآن پر غور و فکر کرنا اور چیز ہے اور تفاسیر پر غور و فکر کرنا اور چیز ہے۔ اصل قرآن کو چھوڑنے سے اور اس کو صحیح طریقہ سے نہ پڑھنے کی وجہ سے ہم قرآن کی صحیح تعلیم سے محروم ہوتے جاتے ہیں اور اس کے نتائج وہ ہیں جو کہ ہم دیکھ رہے ہیں۔ خود قرآن سے جو طریقے قرآن کی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کے درج ہیں ان کو چھوڑنے کی وجہ سے جس اعلیٰ درجہ کی تعلیم سے ہم محروم ہوتے جاتے ہیں اور قرآن کی تعلیم ہمارے غلط طریقہ استعمال کی وجہ سے عمدہ نتائج پیدا نہیں کرتی۔ یہ حسب ذیل مثالوں سے واضح ہو جائیگا۔ جب سے ہم قرآن کی اصلی تعلیم سے دور ہوتے گئے ہیں ہم برابر تنزل کر رہے ہیں اور جیسی قوم کی حالت ہوتی ہے ویسے ہی اس کے اخلاق ہوتے ہیں۔ اگر قوم زندہ ہوتی ہے تو اس کے افراد میں جرأت، ہمت، استقلال، ترقی کی اُمنگ، قربانی وغیرہ عمدہ اخلاق ہوتے ہیں۔ اور اگر قوم مردہ ہوتی ہے تو اس کے افراد پست ہمت سُست، بزدل ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھنے والے ہوتے ہیں۔ قومی تنزل کا مردہ اقوام میں اسقدر اثر ہوتا ہے کہ عمدہ الفاظ کے مفہوم بھی بگڑ کر خراب ہو جاتے ہیں۔

نواب محسن الملک مرحوم نے ایک موقعہ پر اس بات کو اس مثال سے واضح کیا تھا کہ جب مسلمانوں میں کچھ جان تھی تو ان میں وعدہ اور قول و قرار کا دوسرا مفہوم تھا اور جب ان پر مردنی چھا گئی تو انہیں الفاظ کا دوسرا مفہوم ہو گیا۔ پہلے مشہور تھا۔ قول مرداں جان دارد۔ پھر یہ حالت ہو گئی۔ وعدہ آسان ہے وے اس کی وفا مشکل

ہے۔ پھر اس کے بعد یہ حالت ہو گئی ــــ وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا۔ اسی طرح جب سے ہم نے قرآن مجید کو چھوڑ دیا ہے اور اس وجہ سے ہماری حالت خراب ہو گئی ہے۔ تو خود قرآن مجید کے الفاظ کے مفہوم ہی بدل گئے۔ مثال کے طور پر توکل اور صبر کو پیش کرتا ہوں۔

توکل کیا ہے؟

آجکل ہمارے ہاں "توکل" کے معنی ہیں۔ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جانا اور کچھ کام نہ کرنا اس کو کہتے ہیں "توکل" اس کے لئے ایسے قصّے بھی مشہور ہیں کہ ایک صاحب نے اس طرح "توکل" کیا کہ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہا اور خدا سے کہا کہ میں خود کھانا نہیں کھاؤں گا کہ جب تک خود بخود کھانا میرے منہ میں نہ آجائے گا۔ اس طرح وہ کچھ عرصہ تک بیٹھے رہے اس کے بعد کھانے کا ایک خوان ان کے سامنے موجود ہو گیا۔ وہ سمجھے کہ بس کام ہو چکا۔ اور اپنے ہاتھ سے کھانے لگے۔ اتنے میں آواز آئی کہ تو جلدی کر گیا اگر کچھ دیر اور منتظر رہتا تو خود بخود تیرے منہ میں کھانا پہنچ جاتا اور چونکہ قرآن میں توکل کی تعریف ہے۔ اس لئے نکموں کی تعریف کی جاتی ہے کہ فلاں صاحب تو کچھ کام نہیں کرتے۔ گھر سے باہر نہیں نکلتے وہ بڑے متوکل ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید میں توکل کا مفہوم یہ ہے کہ نہایت مشکلات کی حالت میں پوری ہمت سے کام کرنا اور نتیجہ کی طرف سے خائف ہو کر کام نہ چھوڑنا بلکہ نتیجہ کے بارے میں خدا تعالیٰ سے کامیابی کا بھروسہ رکھنا چنانچہ مندرجہ ذیل آیات سے یہ مفہوم صاف طور سے ظاہر ہوتا ہے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دَاخِلُوْنَ ۝ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (سورۃ المائدہ : ۲۳-۲۲)

ترجمہ: "وہ لوگ کہنے لگے کہ اے موسیٰ اس ملک میں تو بڑی زبردست قوم رہتی ہے اور جب تک وہ وہاں سے نہ نکل جائے ہم تو اس ملک میں قدم رکھتے نہیں۔ ہاں وہ لوگ اس میں سے نکل جائیں تو ہم ضرور جا داخل ہوں گے۔ خدا کا ڈر ماننے والوں میں سے دو آدمی تھے جن پر خدا تعالیٰ نے اپنی خاص مہربانی کی وہ بول اٹھے کہ ان پر چڑھائی کر کے دروازے میں گھس پڑو اور جب تم دروازے میں گھس پڑے تو بلاشبہ تمہاری فتح ہے اور تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ تعالیٰ پر توکل کرو۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ۝

(سورۃ یونس : ۷۱)

ترجمہ: "اور اے پیغمبر ان لوگوں کو نوح کا حال پڑھ کر سناؤ کہ جب انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے

کہا کہ بھائیو! اگر میرا رہنا اور خدا تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنانا تم پر گراں گزرتا ہے تو میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہوں۔ پس تم اور تمہارے شریک سب مل کر اپنی ایک بات ٹھہرا لو۔ پھر تمہاری وہ بات تم میں سے کسی پر مخفی نہ رہے۔ پھر جو تم نے کرنا ہے میرے ساتھ کر چکو اور مجھے مہلت نہ دو۔

حضرت نوح علیہ السلام نے کام نہیں چھوڑا۔ اگر نکمے ہو کر بیٹھ جاتے تو اس چیلنج کی ضرورت نہ تھی۔ قوم صرف یہی چاہتی تھی کہ کام نہ کرو۔

صبر کا مفہوم

صبر کے معنی آجکل فقط یہ لیئے جاتے ہیں کہ اگر کسی نہ کسی وجہ سے کوئی مصیبت آپڑے تو غم کا اظہار نہ کریں۔ نیز یہ کہ ذلتیں برداشت کریں اور چپ بیٹھے رہیں پٹتے جائیں اور اف نہ کریں۔ ایسے نالائقوں اور بے حمیتوں کی تعریف کی جاتی ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ قرآن شریف پر عامل ہیں اور قرآن میں صابروں کی تعریف ہے۔ لہذا ایسے اصحاب کی بھی تعریف اور وقعت ہونی چاہیئے حالانکہ قرآن مجید میں صبر کا مفہوم ہے کہ صحیح اصول پر کام کرنے میں جو دقتیں پیش آئیں ان کو برداشت کرنا اور کام کو جاری رکھنا نباہنا اور دقتوں سے گھبرا کر کام کو نہ چھوڑ دینا، چنانچہ یہ مفہوم مندرجہ ذیل آیات سے واضح ہو جائیگا۔

قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ۚ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو اللَّهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ○ وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ○ فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللَّهِ (سورہ بقرہ: ۲۵۱-۲۵۰)

ترجمہ: پھر جب طالوت اور ایمان والے جو اس کے ساتھ تھے نہر کے پار گئے تو جن لوگوں نے طالوت کی نافرمانی کی تھی، کہنے لگے کہ ہم میں تو جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کا دم ہی نہیں ہے اس پر وہ لوگ جن کو یقین تھا کہ ان کو خدا کے حضور میں حاضر ہونا ہے بول اٹھے کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اللہ کے حکم سے تھوڑی جماعت بڑی جماعت پر غالب آگئی ہے اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور جب جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابلہ میں آئے تو دعا کی کہ اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر انڈیل دے اور معرکہ جنگ میں ہمارے پاؤں جمائے رکھ اور کافروں کی جماعت پر ہم کو فتح دے اور پھر اللہ کے حکم سے ان لوگوں نے دشمن کو بھگا دیا۔

وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ○ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ○ (سورۃ آل عمران: ۱۴۶-۱۴۷)

ترجمہ ،، اور بہت سے پیغمبر ہو گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والے لوگ دشمنوں سے لڑے تو جو مصیبت ان کو ان کے رستے میں پہنچی اس کی وجہ سے نہ تو انہوں نے ہمت ہاری اور نہ انہوں نے بودا پن ظاہر کیا اور انہوں نے دشمنوں کے آگے عاجزی کا اظہار کیا اور اللہ تعالیٰ صابروں کو دوست رکھتا ہے اور سوائے اس کے ان کے منہ سے ایک بات بھی تو نہیں نکلی کہ لگے دعائیں مانگنے کہ پروردگار ہمارے گناہ معاف کر اور ہمارے کاموں میں جو ہم سے زیادتیاں ہو گئی ہیں ان سے درگزر فرما اور دشمنوں کے مقابلہ میں ہمارے پاؤں جمائے رکھ اور کافروں کے گروہ پر ہم کو فتح دے ،،

کلام مجید میں صابروں سے توقع کی جاتی ہے کہ کم سے کم اپنی دوگنی قوت پر وہ غالب ہو جائیں گے۔

فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ (سورۃ الانفال : ٦٦)

ترجمہ ،، اگر تم میں سے سو صابر ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر تم میں سے ایسے ایک ہزار ہوں گے تو وہ خدا کے حکم سے دو ہزار کافروں پر غالب رہیں گے اور اللہ تعالیٰ صابروں کے ساتھ ہے ،،

چند مثالیں

اصل قرآن پیش نظر نہ رہنے سے اور اس سے صحیح طریقہ سے مستفید نہ ہونے سے اور اس کی جگہ مختلف لوگوں کی لکھی ہوئی شرحوں کے پیش نظر رکھنے سے ایک تو یہ نقصان ہوا کہ الفاظ کے غلط مفہوم عام طور سے رائج ہو گئے جیسا کہ ظاہر کیا گیا ہے دوسرا نقصان یہ ہوا ہے کہ کلام مجید کی تعلیم کے چند ضروری حصے نظر انداز ہو گئے۔ جب اصل کتاب تو پیش نظر نہ ہو اور بجائے اس کے مختلف لوگوں کی مصنفہ کتابیں پیش نظر ہوں تو لازمی ہے کہ تعلیم اپنے اصلی رنگ میں نہ رہے اور اس کا ایک حصہ ضائع ہو جائے۔ اس کے متعلق چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ مثلاً دنیاوی زندگی کو کامیاب اور قوی بنانے کے وسائل اختیار کرنے کے بارے میں قرآن مجید میں جو کچھ تعلیم ہے اس کی طرف سے بالکل غفلت کی جاتی ہے اور اس طرف بالکل توجہ نہیں کی جاتی۔ حالانکہ دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لیے اور اپنی حالت کامیاب اور قوی بنانے کے لیے کامل تیاری کرنا اور تمام امکانی قوتوں سے کام لینا اسلامی فرائض میں داخل ہے اور اس پر قرآن مجید میں بہت زور دیا گیا ہے۔

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ (سورۃ انفال : ٦٠)

ترجمہ ،، اور تیاری کرو ان کے واسطے جو کچھ تم کر سکو قوت سے اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے کہ ایسا کرنے سے اللہ کے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے اپنی حالت کو ایسا مضبوط رکھو)

سورۃ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَوْ أَرَادُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً (سورۃ توبہ : ٤٦)

ترجمہ "اگر یہ لوگ باہر نکلنے کا ارادہ رکھتے تو اس کے لیئے تیاری کرتے"

سورۃ نسا میں فرمایا۔

وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً (النساء : ۱۰۲)

ترجمہ "کافروں کو تو تمنا ہے کہ تم ذرا بھی اپنے ہتھیاروں اور ساز و سامان سے غافل ہو جاؤ۔ تو یک بارگی تم پر ٹوٹ پڑیں"

بلکہ جو لوگ مسلمانوں کی ترقی میں اور کامیاب اور مضبوط حالت بنانے میں مطلق توجہ نہیں کرتے۔ اور تمام کام چھوڑ کر سارا وقت نوافل پڑھنے میں صرف کرتے ہیں اور اپنی حالت راہبوں کی سی بنا لیتے ہیں۔ کہ ان کی دنیاوی باتوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایسے حضرات کو بہترین نمونہ اسلام سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید کی یہ تعلیم ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کی حالت محفوظ رکھنے اور قوی بنانے میں موقعہ پر ایک دفعہ بھی تساہل کر جائیں۔ تو خواہ وہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کو مسلمان اپنی جماعت سے خارج کر دیں۔ جب تک وہ اپنے اس تساہل سے باز نہ آ جائیں۔ خود حضرات صحابہ کرام میں سے تین اصحاب سے ایک دفعہ ایسے موقعہ پر تساہل ہو گیا تھا (ان صحابہ کے نام یہ ہیں) کعب بن مالک ہلال بن امیہ مرارہ بن الربیع رضی اللہ تعالیٰ عنہم) تو تمام مسلمانوں نے اپنی جماعت سے ان کو علیحدہ کر دیا تھا اور ان سے تمام تعلقات منقطع کر دیئے تھے۔ یہاں تک کہ گفتگو بھی ترک کر دی گئی تھی جب وہ انتہائی پریشانی اٹھا چکے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے ان سے تعلقات دوبارہ وابستہ کیئے۔ ان کا ذکر سورۃ توبہ میں اس طرح ہے۔

وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّا اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ (سورہ توبہ ۱۱۸)

ترجمہ:۔ ان تین شخصوں پر جو پیچھے رکھے گئے تھے یہاں تک جب زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگی کرنے لگی اور وہ اپنی جان سے بھی تنگ آ گئے اور سمجھ گئے کہ خدا کی گرفت سے اس کے سوا اور کہیں پناہ نہیں پھر خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی تاکہ قبول توبہ کے شکریہ میں آئندہ کے لئے بھی توبہ کئے رہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے"

نیز صحیح حدیث میں بھی صاف طور پر درج ہے کہ مسلمانوں کو محفوظ بنانے کی کوشش کرنا نوافل نماز اور روزہ سے زیادہ بہتر ہے۔

روی مسلم عن سلمان الفارسی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال رباط یوم ولیلۃ خیر من صیام شہر وقیامہ قال الامام احمد وقال عثمان وهو یخطب علی منبرہ سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول حرس لیلۃ فی سبیل اللہ افضل من الف لیلۃ قیام لیلہ ویصام نھارھا۔

ترجمہ "مسلم بن سلیمان فارسی سے روایت ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ

آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی حفاظت کرنا نوافل (نماز، روزہ سے بہتر ہے اور ایک دن رات سرحد پر پہرہ کا کام کرنا ایک مہینہ کے روزہ سے اور نماز سے بہتر ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ عثمانؓ نے منبر پر خطبہ پڑھنے کے وقت فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ کے راستہ میں ہر ایک رات کی پاسبانی ہزار رات سے بہتر ہے کہ جن میں رات کو نوافل پڑھے جائیں اور دن کو روزے رکھیں جائیں۔

تفسیر ابن کثیر جلد نمبر ۲ صفحہ ۳۶۳ میں درج ہے کہ ۱۷۰ھ میں عبداللہ بن مبارک نے جو مسلمانوں کو محفوظ اور قوی بنانے کی کوشش میں مصروف تھے حسب ذیل شعر فضیل بن عیاض کو لکھ کر روانہ کیا تھا۔ فضیل ابن عیاضؒ صوفیہ کے امام ہیں اور اس وقت مسجد حرام میں عبادات اور روحانی ریاضتوں میں مصروف تھے۔

یاعابد الحرمین لو ابصرتنا لعلمت انک فی العبادۃ تلعب۔

ترجمہ: اے حرمین کے عابد اگر تو ہماری حالت دیکھے تو جان لے کہ تو عبادت میں کھیل رہا ہے تیری عبادت مثل لہو ولعب کے ہے۔"

جس وقت حضرت فضیل بن عیاض نے یہ شعر پڑھا تو رو پڑے اور فرمایا کہ عبداللہ بن مبارک نے صحیح لکھا ہے۔

(فلما قرأہ زرفت عیناہ وقال صدق ابوعبدالرحمٰن)

دوسری مثال یہ ہے کہ معاش حاصل کرنا اور اس کے لیئے کوشش کرنا اور اس کے وسائل حاصل کرنا دنیاداری کو بزعم، خود سے علیحدہ تصور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ خود قرآن کی تعلیم ہے۔

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (سورہ الجمعہ : ۱۰)

"پھر جب نماز ہو چکے تو اپنی اپنی راہ لو اور خدا کے فضل (یعنی معاش) کی جستجو میں لگ جاؤ۔"

چنانچہ اکثر صحابہ اور آئمہ سلف کسب معاش کے لیئے تجارت وغیرہ جیسے وسائل میں مصروف رہتے تھے بخلاف اس کے آجکل ہمارے مقتدی، ان وسائل میں مصروف ہونا خلاف تقدس اور کسر شان سمجھتے ہیں یہ بات قرآن کی تعلیم سے بعد کا نتیجہ ہے۔

تیسری مثال:۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مسلمان دنیا میں ذلیل اور مسکین زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید کی تعلیم کے یہ بالکل خلاف ہے اور قرآن مجید میں ذلت اور مسکنت کو خدا کے غضب اور عذاب کی نشانی بتایا ہے جو حسب ذیل آیات سے ظاہر ہے۔

سورہ زمر میں ہے۔

كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَأَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ فَأَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ (سورہ زمر ۲۶ - ۲۵)

"جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں انہوں نے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا تو ان کو عذاب نے ایسی طرف سے آلیا کہ انہیں اس کی خبر بھی نہ تھی تو ان کو اس دنیا کی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے ذلت کا مزہ چکھا دیا"

سورہ بقرہ میں یہود کی خرابیوں کے ذکر کے بعد ان کو عذاب سے اس طرح ڈرایا گیا تھا۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ۔ (سورہ بقر ۸۵)

ترجمہ:۔ "تو تم کتاب الٰہی کی بعض باتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے تو جو لوگ تم میں سے ایسا کریں گے اس کے سوا ان کا اور کیا بدلہ ہو سکتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ان کی ذلت ہو اور آخر کار قیامت کے دن بڑے ہی سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں (یعنی دنیا کی ذلت بدعملیوں کی سزا ہے)

دوسرے موقعہ پر سورہ آل عمران میں اہل کتاب کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ۔ (سورہ آل عمران ۱۱۱)

ترجمہ "جہاں دیکھو ذلت ان کے سر پر سوار ہے اور خدا کے غضب میں گرفتار ہیں اور محتاجی ہے کہ الگ ان کے پیچھے پڑھ گئی ہے (یعنی مسکنت خدا کے غضب کی نشانی ہے)"

بخلاف اس کے جن لوگوں پر خدا تعالیٰ اپنا فضل و کرم فرماتا ہے۔ ان کو برتری اور سلطنت عطا فرماتا ہے۔

لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (سورہ آل عمران: ۱۳۹)

ترجمہ " نہ ہمت ہارو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب ہو گے اگر تم مومن ہو۔"

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ۔ (الانبیاء: ۱۰۵)

ترجمہ " اور ہم زبور میں پند و نصیحت کے بعد یہ بات لکھ چکے ہیں کہ ہمارے نیک بندے زمین کی سلطنت کے وارث ہوں گے۔"

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ۔ (النور: ۵۵)

ترجمہ "تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کرتے ہیں ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کی خدمت (یعنی سلطنت) ضرور عطا فرمائے گا۔"

چوتھی مثال:۔ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ جنت کے کامل استحقاق کے لئے نماز پڑھنا، روزے رکھنا۔ حج کرنا، تسبیح اور درود و ظائف پڑھنا اور داڑھی رکھنا کافی ہے۔ اگر پورا مذہبی اور جنتی مسلمان بننے کے لئے صرف یہی شرائط سمجھی جائیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ مسلمان اشاعت و حفاظت اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و ترقی کے لیے اپنے آپ کو مشقت اور محنت میں مبتلا کریں اور آرام و راحت کی زندگی بسر نہ کریں۔ جب ابتدائے عمر سے یہ ذہن

نشین ہو چکا ہو کہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے بغیر بھی کوئی شخص کامل مسلمان ہو سکتا ہے تو پھر قومی حیات کے لئے ایثار کرنے پر کیا چیز ہم کو آمادہ کر سکتی ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں صاف طور پر درج ہے کہ ہماری نجات کے لیئے اس زندگی میں پوری اور ہر طرح کی کوشش کی ضرورت ہے۔

سورہ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۤءُ وَالضَّرَّاۤءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (سورۃ البقرۃ : ۲۱۴)

ترجمہ "کیا تم کو خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی تک تم کو ان لوگوں کی سی حالت پیش نہیں آئی جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں کہ ان کو سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں اور وہ جھرجھرائے بھی گئے یہاں تک کہ پیغمبر اور ایمان والے جو ان کے ساتھ تھے۔ کہنے لگے کہ خدا کی مدد کب آئے گی؟ خبردار رہو اللہ تعالیٰ کی مدد قریب ہے۔"

سورہ آل عمران میں فرمایا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۔ (آل عمران ۔ ۱۴۲)

ترجمہ "کیا تم کو خیال ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم سے وہ لوگ معلوم نہیں کئے جو مجاہد ہیں اور نہ وہ معلوم کئے جو ثابت قدم رہتے ہیں۔"

سورہ توبہ میں فرمایا ہے

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۔ (سورۃ التوبۃ : ۱۶)

"کیا تم نے ایسا سمجھ رکھا ہے کہ چھوٹ جاؤ گے اور ابھی اللہ نے وہ لوگ نہیں معلوم کئے جو تم میں سے مجاہد ہیں اور سوائے اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے کسی کو اپنا ولی دوست نہیں بناتے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔"

سورہ محمد میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ وَنَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ ۔ (سورۃ محمد : ۳۱)

"اور تم کو ہم ضرور آزمائیں گے تاکہ تم میں جو مجاہد ہیں اور برداشت کرنے والے ہیں ان کو ہم معلوم کر لیں اور تاکہ تمہارے حالات کو معلوم کر لیں۔"

سورہ عصر میں حق اور صبر کی وصیت کو سب پر لازمی قرار دیا گیا ہے اور ظاہر کیا گیا ہے کہ بغیر اس کے سب لوگ نقصان میں ہیں۔

وَالْعَصْرِ ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

(سورۃ العصر)

"زمانہ کی قسم انسان نقصان میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیئے اور ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرتے رہے اور صبر کی وصیت کرتے رہے"۔
امام رازی اپنی تفسیر کبیر میں اس سورۃ کی تشریح فرماتے ہوئے صاف طور پر فرماتے ہیں۔

فیھا وعید شدید وذالك لانه تعالیٰ حکم بالخسارۃ علی جمیع الناس سوی الذین یومنون ویعلمون بهذہ الاشیاء الاربعة وھی الایمان والعمل الصالح والتواصی بالحق و لتواصی بالصبر فدل ذالك علی ان النجاۃ معلقة بمجموع ھذہ الامور وانه کما یلزم المکلف تحصیل مایخص نفسه فکذالك یلزمه فی غیرہ امور منها الدعاء الی الدین والنصیحة والامر بالمعروف والنھی عن المنکر ثم کرر التواصی یتضمن الاولی الدعاء الی الله والثانی الثبات علیه دلت الایة علی ان الحق ثقیل و ان المحن تلازمه فکذالك قرن به التواصی۔

ترجمہ "اس میں وعید سخت ہے۔ اس لیئے کہ خدا تعالیٰ نے خسارہ کا حکم لگایا ہے تمام لوگوں پر سوائے اس کے جو ان چار چیزوں پر کاربند ہو اور وہ ایمان عمل صالح تواصی بالحق و تواصی بالصبر ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نجات ان چاروں کے مجموعہ پر منحصر ہے اور یہ کہ جسطرح ہر ایک مکلف شخص کو ان چیزوں کا حاصل کرنا ضروری ہے جو اس کے نفس کے لیئے خاص ہیں۔ اسی طرح وہ امور بھی ضروری ہیں۔ جو غیروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ منجملہ ان کی مذہب کی طرح دعوت دینا اور خیر خواہی کرنا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا اور تواصی کو مکرر لائے ہیں تاکہ پہلا لفظ دعوت الی اللہ پر دلالت کرے اور دوسرا لفظ اس پر ثابت قدم رہنے پر یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ حق ایک بھاری چیز ہے اور بہت سی تکلیفیں اس کے لئے لازمی ہیں۔ اسی لیے تواصی بالصبر کا حکم دیا گیا ہے"۔

میں پیشتر عرض کر چکا ہوں کہ اصل قرآن چھوڑنے سے اور اس کے صحیح طریقہ سے مستفید نہ ہونے سے ایک تو قرآن کے الفاظ کے غلط مفہوم رائج ہو گئے ہیں اور دوسرا اب یہ واضح ہو گیا ہے کہ اس کی تعلیم کا ایک حصہ ہم نے بھلا دیا ہے۔ حالانکہ کلام مجید میں بہت زور اس پر دیا گیا ہے کہ تعلیم کے کسی حصے کو نظر انداز نہ کرو بلکہ سب کو پیش نظر رکھو ورنہ ذلت اور عذاب نازل ہوگا۔ بنی اسرائیل سے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ۔

ترجمہ "تو کیا کتاب الٰہی کی بعض آیتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے تو جو لوگ تم میں سے ایسا کریں تو سوائے اس کے ان کا اور کیا بدلہ ہو سکتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ان کی رسوائی ہے اور آخر کار قیامت کے دن بڑے ہی سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں"۔

صحیح طریقہ تعلیم کو چھوڑنے سے تیسرا بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ کلام مجید کی تعلیم پر پورا غور و فکر نہ کرنے سے کلام

مجید کے بعض حصوں کو محض چند مکاتبوں اور تفریحی باتوں کا درجہ دیتے ہیں اور ان سے مستفید ہونے کا مقصد ہی نہیں کرتے اور اس طریقہ سے ہم کلام مجید کی تعلیم کے ایک حصے سے صحیح معنوں میں مستفید ہونے سے محروم ہو گئے ہیں قرآن مجید میں جو قصص مذکور ہیں۔ ان کو ہم صرف یہ درجہ دیتے ہیں۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ۔ (سورہ انفال : ۳۲)

"یہ اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں ر ہم ان قصوں کو اسی درجہ پر رکھتے ہیں۔"

حالانکہ کلام مجید میں اس حصہ تعلیم کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ وَجَآءَكَ فِیْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (سورہ ھود : ۱۲۰)

ترجمہ: "اے پیغمبر دوسرے پیغمبروں کے جتنے قصے ہم تم سے بیان کرتے ہیں ان کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کی ڈھارس بندھاتے ہیں اور ان قصوں کے ضمن میں ایک تو جو حق بات تھی وہ تمہارے پاس پہنچی اس کے علاوہ اس ضمن میں مسلمان کے لئے نصیحت اور یاد دہانی ہے۔"

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ (الاعراف : ۱۷۶)

"ان سے قصے بیان کرو تاکہ یہ لوگ غور کریں۔"

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔ (سورہ النساء : ۲۶)

ترجمہ "اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ (انبیاء وصلحا) جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ ان کے طریقے تم سے کھول کھول کر بیان کرے اور تم کو انہیں کے طریقوں پر چلائے۔"

تیسرا باب

قصص القرآن

قرآن مجید میں ان قصوں کے درج ہونے کا مقصد یہ ہے کہ ہم ان واقعات سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے لئے ان کو شمع ہدایت بنائیں اور جو انبیاء اور صلحا پہلے گزرے ہیں ان کے نقش قدم پر چل کر پوری کامیابی حاصل کریں اور ہم ان کو صرف کہانیاں سمجھتے ہیں اور کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے ان قصص میں ہمارے لیے ایسی تعلیم موجود ہے کہ اگر ہم ان سے فائدہ اٹھانا چاہیں انہیں اپنے پیش نظر رکھیں اور ان پر عمل کریں تو دنیا کی بہترین قوم بن سکتے ہیں چنانچہ قرون اولی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ نمونہ کے طور پر چند قصص کی تعلیم کا کچھ حصہ پیش کرتا ہوں۔

حضرت یوسف علیہ السلام

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کو ہم صرف ایک حسن و محبت کا واقعہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس کو قرآن مجید میں احسن القصص کہا گیا ہے جس طرح ایک صاحب سے ان کو پورا شاہنامہ سنا چکنے کے بعد شاہنامہ کے کسی عمدہ شعر پڑھنے کی خواہش کی گئی تو انھوں نے یہ شعر پڑھا تھا۔

منیژہ منم دخت افراسیاب   برہنہ تنم را نہ دید آفتاب

یہی ہماری حالت ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں علاوہ اس کے کہ اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے آئندہ واقعات کی خبر دی گئی ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے مثل ہونے والے تھے کہ آپ کو آپ کے بھائی وطن سے علیحدہ کریں گے اور وطن سے باہر جانے کے بعد دوسری جگہ آپ کو کامیابی ہوگی اور اس کے بعد آپ کے بھائی قریش آپ سے معافی چاہیں گے اور آپ ان کو معافی عطا کریں گے وغیرہ وغیرہ۔

علاوہ اس کے اس قصہ میں ان اخلاق کی تعلیم ہے جس سے ایک شخص غلام کی حیثیت سے ترقی کر کے حکومت کے درجہ تک پہنچ سکتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام بحیثیت ایک غلام کے مصر میں داخل ہوئے اور آپ کو عزیز مصر نے خرید لیا یہ آپ کی پہلی حالت ہے اس درجہ سے حکومت تک پہنچنے کے لیئے خاص طور پر ان اخلاق کی ضرورت ہے۔

جذبات پر قدرت۔ امانت، صحیح اصول کی پابندی میں دقتیں برداشت کرنا خواہ کچھ ہی حالت ہو۔ اپنا کام

جاری رکھنا۔ پریشانیوں سے گھبرا کر اپنا کام نہ چھوڑنا ان اخلاق کی تعلیم حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات سے اچھی طرح مل سکتی ہے۔ زلیخا کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا۔ اس میں اپنے جذبات پہ قدرت رکھنے اور آقا کی امانت میں خیانت نہ کرنے کی نہایت اچھی نظیر ہے جس وقت زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ دھمکی دی،

وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَا اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ۔

(سورۂ یوسف : ۳۲)

ترجمہ: "اور جس کام کرنے کو میں کہہ رہی ہوں اگر اس کو نہیں کرے گا تو ضرور قید کیا جائیگا اور ضرور بے عزت بھی ہو گا۔"

تو آپؑ نے فرمایا

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَيْهِ ۔ (سورہ یوسف : ۳۳)

ترجمہ: "کہا اے میرے پروردگار جس حرکت کی طرف مجھے یہ بلا رہی ہے۔ قید ہی میں رہنا مجھ کو اس سے کہیں زیادہ پسند ہے۔"

اپنے صحیح اصول کے خلاف عمل کرنے کی بجائے قید کی مشقتیں برداشت کرنا مجھ کو پسند ہے جس وقت آپ قید خانہ میں محبوس کیے گئے تو آپ نے وہیں قیدیوں میں تبلیغ شروع کر دی جیل خانہ میں آپ نے اس طرح تبلیغ شروع کی۔

مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ الآیۃ یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۳۹) اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۔ (سورہ یوسف: ۳۸-۳۹ (۴۰-۳۹))

ترجمہ: "ہم کو شایان نہیں کہ خدا کے ساتھ کسی چیز کو شریک بنائیں۔ اے یاران مجلس بھلا دیکھو تو سہی کہ جدا جدا معبود اچھے یا خدائے یگانہ زبردست، تمام جہاں میں حکومت تو بس ایک اللہ کی ہے اور اس نے حکم دیا ہے کہ صرف اسی کی پرستش کرو۔ یہی دین کا سیدھا راستہ ہے۔"

اپنے مقصد کو نہ چھوڑنے اور ہر حالت میں کام جاری رکھنے کے لیئے خواہ آزادی ہو یا نہ ہو یہ نہایت عمدہ سبق ہے غرض حضرت یوسف علیہ السلام ایک اجنبی ملک میں غلامی کے درجے سے ترقی کر کے اس درجہ تک پہنچے۔

کہ آپ نے فرمایا

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ ۔ (سورہ یوسف: ۱۰۱)

ترجمہ: "اے میرے پروردگار تو نے مجھے حکومت سے حصہ دیا۔"

قصہ طالوتؑ جالوت

طالوت اور جالوت کے قصے کو محض ایک واقعہ کی حیثیت دی جاتی ہے۔ حالانکہ اس میں کام کرنے والوں کے لیئے

نہایت اعلیٰ درجے کی ہدایتیں موجود ہیں۔

کام کرنے کے لیئے افسر (لیڈر) کی ضرورت افسر (لیڈر) کے صفات کہ علمی اور جسمانی دونوں قوتیں اس میں اعلیٰ درجے کی موجود ہونا ضروری ہیں اور اس بات کی تردید کہ مالدار ہونا افسری (قیادت) کے لیے شرط ہے۔ افسر (لیڈر) کی صفات کے علاوہ اس کے ساتھ کام کرنے والوں کی صفات کا بھی ذکر ہے کہ لوگ آزمائش کے بعد منتخب شدہ ہوں۔ اس کے بعد ظاہر کیا گیا ہے کہ کامیابی کے لیے زیادتی تعداد لازمی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر تعداد کم ہو لیکن لوگ ثابت قدم ہوں اور مشکلات برداشت کرنے والے ہوں اور جذبات پر قدرت رکھتے ہوں تو کثیر جماعت پر غالب ہوں گے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ..... وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ۭ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۭ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ..... فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّىْ ... فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ...

(سورۃ البقرہ: ۲۵۱ - ۲۴۶)

ترجمہ:۔ اے پیغمبر کیا تم نے بنی اسرائیل کے سرداروں پر نظر نہیں کی۔ کہ ایک زمانہ میں انہوں نے موسیٰ کے بعد اپنے وقت کے پیغمبر سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کیجئے کہ ہم اس کے سہارے اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور ان کے پیغمبر نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری درخواست کے مطابق طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا۔ اس پر کہنے لگے کہ اس کو ہم پر کیوں کر حکومت مل سکتی ہے حالانکہ اس سے تو حکومت کے زیادہ ہم حقدار ہیں کہ اس کو مال و دولت کے لحاظ سے بھی کچھ ایسی فارغ البالی نصیب نہیں ہے۔ پیغمبر نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر حکومت کے لیئے اس کو پسند فرمایا ہے، علم اور جسم میں اس کو بڑی فراخی دی ہے۔ پھر جب طالوت فوجوں سمیت اپنے قیام سے روانہ ہوا تو اس نے اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ راستہ میں ایک نہر پڑے گی۔ اللہ تعالیٰ اس نہر سے تمہارے صبر کی جانچ کرنیوالا ہے جو اس کا پانی پی لے گا وہ ہمارا نہیں پس ان لوگوں میں سے معدودے چند کے سوا سبھی نے تو اس سے پی لیا۔ پھر جب طالوت اور ایمان والے جو اس کے ساتھ تھے نہر سے پار گئے اور جن لوگوں نے طالوت کی نافرمانی کی تھی کہنے لگے کہ ہم میں تو جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کا دم نہیں ہے۔ اس پر وہ لوگ جن کو یقین تھا کہ اس کو خدا کے حضور میں حاضر ہونا ہے بول اٹھے

کہ اکثر ایسا ہی ہوا ہے کہ اللہ کے حکم سے تھوڑی ہی جماعت بڑی جماعت پر غالب آ گئی ہے اور اللہ تعالیٰ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے اور جب جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابلہ میں آئے تو دعا کی کہ اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر انڈیل دے اور جنگ میں ہمارے پاؤں جمائے رکھ اور کافروں پر ہم کو فتح دے پھر ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے دشمنوں کو بھگا دیا۔"

میدان جنگ میں کامیابی کے لیئے اس قصے میں خصوصیت سے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اگر افسر (لیڈر) اعلیٰ درجے کا ہو اور اس کے ساتھ خدا سے تعلق رکھنے والے ثابت قدم جذبات پر قدرت رکھنے والے اشخاص ہوں۔ تو پھر خواہ تعداد کم ہو یہ کامیاب ہوں گے۔ عین حالت جنگ میں خدا سے دعا کرنے کا بھی ذکر ہے، جن حضرات پر مادیت کا رنگ غالب ہو گا وہ خیال کرتے ہوں گے کہ یہ میدانِ جنگ میں روحانیت سے کیا تعلق اس وقت تو صرف سامانِ حرب کی ضرورت ہے ان کو یورپ کے ایک سپہ سالار کا قول آتا ہو گا۔

کہ خدا بھاری توپوں کی طرف ہوتا ہے۔

لیکن ان حضرات کو معلوم ہونا چاہیئے کہ خود یورپ جو مادیت کا مرکز ہے ایسی مادیت کو خیرباد کہہ رہا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ جرمن کے مشہور جرنیل وان برن ہارڈی نے اپنی کثیر الاشاعت کتاب (جرمنی دی نیکسٹ وار) میں جو ۱۹۱۱ء میں شائع ہوتی ہے صر ۱۳۳ پر میدان جنگ میں کامیاب ہونے کے لیئے وہی شرائط درج کئے ہیں جو آج سے تیرہ سو سال پہلے قرآن مجید اس قصے کے ذریعہ سے بتلا چکا ہے۔ جرمنی نے فن حرب میں جو کچھ ترقی کی ہے۔ اس کو مدنظر رکھ کر جب یہ خیال کیا جائے کہ اس کے قابل ترین جرنیل کامیابی کے لیئے آج بھی وہی اصول بہترین سمجھتے ہیں جو صدیوں پیشتر قرآن مجید کے ذریعہ سے شائع ہوتے ہیں۔ تو کچھ اندازہ قرآن کی تعلیم کے متعلق ہو سکتا ہے۔ جرنیل وان برن ہارڈی لکھتے ہیں۔

Laid dwon by the law of Numbers.
The true elements of super mority
under the present system of gigantne
armies are seen to be spiritual
and moral strength

" لیکن ایک حد تک جو کہ قانون اعداد سے وابستہ ہے۔ اس زمانے کی بے شمار افواج کے نظام میں فوقیت کے حقیقی عناصر روحانی اور اخلاقی قوتیں ہیں اور بہت بڑی تعداد والی فوج ایک قلیل تعداد والی عمدہ اور صابر افسر رکھنے والی اور جان باز فوج سے شکست کھا جائے گی۔"

اس موقعہ پر میں یہ ظاہر کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ یورپ کی مادیت نے ہمارے بعض حضرات پر ایسا اثر کیا ہے کہ اس سے متاثر ہو کر وہ حضرات بعض اسلامی باتوں میں تاویل کرنے لگے۔ مثلاً حصول مقصد کے لیئے دعا کو بھی منجملہ ذرائع کے ایک سمجھنے سے انکار کر دیا گیا ہے۔ فرشتوں کے متعلق کہا گیا کہ بذاتِ خود ان کی کوئی ہستی نہیں۔ بلکہ مختلف قوتوں کو فرشتوں کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔ بعض حالات میں جو اجازت تعداد ازدواج کی ہے۔ اس کی بھی ممانعت

ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ اطمینان بخش بات ہے کہ آہستہ آہستہ خود یورپ اور امریکہ کے فاضل اسلامی خیالات کے پیرو ہوتے جاتے ہیں۔

جنگ عظیم کے دوران میں جس وقت بحر شمال میں انگلستان کے جنگی جہاز جرمن جہازوں سے سرگرم پیکار ہوتے تو بذریعہ تار گرجا گھروں کو اطلاع دی گئی کہ لوگوں کو جمع کرکے فوراً خدا سے کامیابی کے لیئے دعا شروع کردی جائے اس سال قیصر جرمنی کی سالگرہ کے موقعہ پر کوئی جشن پہلے جیسے نہیں کیئے گئے۔ بلکہ ہدایت کی گئی تھی کہ تمام دن محض دعا کی جائے۔

فرشتے

ان واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ خود یورپ میں بھی آجکل دعا کو کسقدر اہمیت دی جاتی ہے۔ سر آلیور لاج۔ ڈی۔ ایس۔ سی، ایل، ڈی۔ ایف۔ آر۔ ایس۔ پرنسپل برمنگھم یونیورسٹی پریذیڈنٹ ایسوسی ایشن ان سائنس اپنے مضمون کیا موت کے بعد زندگی ہے؟ میں جو دسمبر ۱۹۱۴ء کے ریویوان۔ ریویوز میں شائع ہوا ہے۔

"We here on this planet are limited in certain wayes and are blind to much that is gong on, but I tell you that we are surrounded by beings working with us. All that which religions tell us that angels are with us is, I belive literally true that is why I say that man is not alone. That is why I say that I know he is surrounded by intelligences. and I tel you that there are higher intelligences to which we are as ants. Our senses give us certain information. But it is very limited we could not explore the Universe very well if we only and our senses. We increase them, we add to

them by instruments of all kinds, microscopes, telescopes and so on are additions to our senses and so we learned more, But aided however much they may be the senses, tell us still only a little and there are a multitude of things which at present. we are in complete ignorance and yet with some of the things we are in touch not through our senses, for we are not body alone. We are mind consciousness and souls as well. And with some of these higher intelligences men has intercourse and connection throu-gh channels other than those of the bodily organs."

"فرشتوں کے متعلق لکھتے ہیں۔ ہم اس سیارہ (زمین) میں بعض حیثیتوں سے محدود حالت میں ہیں اور گردوپیش جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس میں سے بہت سے حصّے ہمیں نظر نہیں آتے لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ ہم ایسی ہستیوں سے گھرے ہوتے ہیں۔ جو کہ ہمارے ساتھ کام کرتی رہتی ہیں۔ میرا یقین ہے کہ جیسا کہ مذاہب ہمیں بتلاتے ہیں فرشتے ہمارے ساتھ ہیں یہ بالکل صحیح ہے اسی لیے میں کہتا ہوں کہ انسان تنہا نہیں ہے کہ میں جانتا ہوں کہ وہ روحانی ہستیوں سے گھرا ہوا ہے اور میں تم سے کہتا ہوں کہ اعلےٰ روحانی ہستیاں موجود ہیں۔ جن کے مقابلہ میں ہم چیونٹیوں کی رکھتے ہیں۔ ہمارے حواس خمسہ ہم کو بعض معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ لیکن یہ بہت محدود معلومات ہوتی ہے۔ اگر صرف ہمارے حواس ہی موجود ہوتے ہیں تو ہم عالم کی تحقیقات اچھی طرح سے نہ کر سکتے۔ لیکن ان حواس کو ہم ترقی دیتے ہیں اور ہر قسم کے آلات کے ذریعے سے ان میں اضافہ کرتے ہیں۔ خوردبین اور دوربین وغیرہ ہمارے حواس کی قوتوں میں اضافہ کرنیوالی ہیں اور اس طریقہ سے ہم زیادہ علم حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن گو ان حواس کو کتنی ہی مدد دی جائے یہ ہمیں بہت ہی کم اطلاعیں بہم پہنچاتے ہیں اور کثرت سے ایسی چیزیں موجود ہیں جن سے ہم ابھی تک محض ناواقف ہیں۔ بایں ہمہ ان میں سے بعض سے ہمارا تعلق ہے۔ لیکن یہ تعلق ہمارے حواس کے ذریعہ سے

نہیں ہوا۔ کیونکہ ہم صرف جسم نہیں ہیں۔ ہم نفس ناطقہ، وجدان اور روح بھی ہیں، اور بعض اعلیٰ روحانی ہستیوں سے انسان کا تعلق ایسے ذرائع سے ہے جو کہ جسمانی اعضاء سے وابستہ نہیں ہے۔

تعدد ازدواج امریکی محقق کی نظر میں:۔

تعدد ازدواج کے متعلق امریکہ کے محقق اور جرنلسٹ مسٹر ہنری رسالہ دی فارم میں فرماتے ہیں۔

"The true goal of the feminest movement is polygamy legallised regulated by
The state respectable and moral.
The experiment of theoratically
iment of theoratically strict monogamy has never been a success.
It has never existed as an actual condition at any period of the history of the world, and does not exist today.

" تحریک نسوانی کا حقیقی مطمع نظر ایسا تعدد ازدواج (ایک سے زیادہ بیویاں ہونا) ہے۔ جو قانون ہو اور سلطنت کے ذریعہ سے اس کا انتظام ہو اور مبنی بر اخلاق حسنہ ہو۔ وحدت ازدواجی (ایک بیوی ہونا) کے سخت اصول کا تجربہ کبھی کامیاب نہیں ہوا اور دنیا کی تاریخ کے کسی حصہ میں اس کا وجود بحیثیت واقعہ حقیقی نہیں رہا اور نہ آج اس کہیں وجود ہے۔

بازاری عورت کا المناک مگر روزمرّہ کا مشاہدہ ہی تنہا اس کا کافی ثبوت ہے۔ اگرچہ اب تک ازراہ مروت اس کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے۔ اسکا وجود فقط اسی حالت میں غائب ہو سکتا ہے جب کہ انسانی فطرت بالکل بدل جائے اور یا پھر مرد عورت کے باہمی تعلقات ایسے طریقوں سے بدل جائیں جو وحدت ازدواجی کی نسبت ممکن تر اور عقل کے زیادہ مطابق ہوں۔ یہ پیشگوئی کی جا سکتی ہے کہ تعدد ازدواج کا قانونی طریقہ سے دوبارہ اجراء طلاق کے کم کرنے میں بہت زیادہ موثر ہو گا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے بعض غیر معمولی مناقشے اور نزاعات جو موجودہ وحدت ازدواجی کے اصول اور اس کے ناقص حالات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں وہ جاتے رہیں گے۔

اس موقعہ پر ان چند مسائل کے ذکر کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ اسلامی تعلیم کا وہ نہایت قلیل حصہ بھی جس کے متعلق یہ سمجھا گیا تھا۔ کہ یورپ کی مادیت کی تہذیب سے رنگے ہوئے مسلمان اسے قبول نہ کر سکیں گے (اور غالباً اس

لیے اس میں تاویلیں شروع کر دی گئی تھیں)۔ استقرار فطرت کے مطابق ہے کہ تجربہ کے بعد آخر کار اس کے سخت ترین مخالف بھی اس کے پیرو ہونے پر مجبور ہوتے جاتے ہیں۔

یورپ اور امریکہ کے فاضلوں کے یہ اقتباسات میں ان باتوں کی صحت کے لیے بطور استدلال کے پیش نہیں کر رہا ہوں، کیونکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

قصّہ حضرت ابراہیم

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں یہ تعلیم ہے کہ چاہے اپنے نہایت عزیز رشتہ دار اور ساری دنیا اپنے خلاف ہو جائے مگر خدا کے احکام کی پیروی ہرگز نہ چھوڑے اور اپنے صحیح مقصد کی تکمیل میں مصروف رہے۔ خواہ کتنی ہی مشکلات برداشت کرنا کیوں نہ پڑیں اور کتنی ہی قربانیوں کی ضرورت کیوں نہ ہو۔ نیز خدا کے احکام کی تعمیل کا نمونہ جناب نے پیش کیا ہے کہ اپنے بیٹے تک کی قربانی کے لیے تیار ہو گئے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ۔ (الممتحنة : ۴)

ترجمہ: مسلمانو! ابراہیم اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے (بغیر مسلمان اس وقت کے) پیروی کرنے کے لیے تمہارے لیے ان کا ایک اچھا نمونہ ہو گزرا ہے جب کہ انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ ہم کو تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو۔ کچھ بھی سروکار نہیں ہے ہم تم لوگوں کے عقیدے کو بالکل نہیں مانتے اور ہم میں اور تم میں کھلم کھلا عداوت اور دشمنی قائم ہو گئی ہے اور یہ دشمنی تو ہمیشہ کے لیے رہے گی جب تک کہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ۔"

حضرت ابراہیم نے اپنی بات کو پوری طرح سمجھایا لیکن جب وہ مقصد کے مخالف رہا تو آپ نے اس سے بھی قطع تعلق کیا۔

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْئًا ۔۔۔۔ قَالَ أَرَاغِبٌ أَنتَ عَنْ آلِهَتِي يَا إِبْرَاهِيمُ لَئِن لَّمْ تَنتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكَ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَأَدْعُو رَبِّي ۔ (سورہ مریم : ۴۸-۴۵)

ترجمہ: جب انہوں نے اپنے باپ سے کہا۔ اے باپ آپ کیوں بتوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ کچھ سنتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکتے ہیں۔ اور ابراہیم کے باپ نے کہا کہ کیا تو

میرے معبودوں سے پھرا ہوا ہے۔ اگر تو ایسی باتوں سے باز نہیں آئے گا تو ضرور میں تجھے سنگسار کروں گا اور اپنی خیر چاہتا ہے تو میرے سامنے سے دور ہو۔ ابراہیم نے کہا تیری سلامتی رہے میں تیرے گناہ بخشواؤں گا۔ اپنے رب سے بے شک وہ مجھ پر مہربان ہے اور میں نے تم بت پرستوں کو اور تمہارے ان بتوں کو جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو سب کو چھوڑا اور اپنے پروردگار ہی کو پکارتا ہوں

حضرت ابراہیمؑ کو آپ کی قوم نے کہا۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِۦٓ إِلَّآ أَن قَالُوا اقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ ۔ (سورہ العنکبوت: ۲۴)

ترجمہ: "ابراہیم علیہ السلام کی قوم کا اس کے سوا کوئی جواب ہی نہیں تھا کہ کہنے لگے کہ اسکو مار ڈالو، جلا دو"

لیکن آپ برابر ثابت قدم رہے اور اپنا کام کرتے رہے۔ اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو کامیاب کیا اور سب مصیبتوں سے نجات دی۔

قصّہ حضرت نوحؑ

حضرت نوح علیہ السلام کے واقعات کو ہم صرف طوفان نوح کے حالات سے محصور کرتے ہیں اور فقط اسی پر بحث ہوتی ہے کہ پانی کسقدر برساتھا اور کہاں کہاں طوفان کا اثر پہنچا تھا اور کہاں تک پہنچ سکتا ہے۔

حالانکہ ان واقعات سے استقلال سے مسلسل عرصہ دراز تک کام کرنے کی اور اپنے مقصد کے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں کرنے کی تعلیم حاصل ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ رشتہ دار اگر اچھے عمل نہ کرتے ہوں اور مقصد کے خلاف ہوں تو ان سے تعلق نہ رکھا جائے وہ رشتہ دار ہی نہیں۔ حضرت نوحؑ خدا تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَنَهَارًا ۝ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيٓ إِلَّا فِرَارًا ۝ وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوٓا أَصَٰبِعَهُمْ فِيٓ ءَاذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝ ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝ ثُمَّ إِنِّيٓ أَعْلَنتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ۝ (سورہ نوح: ۵ - ۹)

ترجمہ: "خدا سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو رات کے وقت بھی بلایا اور دن کے وقت بھی بلایا تو میرے بلانے کا ان پر یہی اثر ہوا کہ جتنا زیادہ بلایا اتنا ہی زیادہ بھاگے اور جب میں نے ان کو بلایا کہ میری طرف رجوع ہوں۔ اور تو ان کے گناہ معاف فرمائے تو انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اوپر سے اپنے کپڑے اوڑھ لئے اور ضد کی اور شیخی میں اکڑ اکڑ بیٹھے۔ پھر میں نے ان کو پکار کر بلایا اور ان کو ظاہر بھی سمجھایا اور پوشیدہ بھی سمجھایا۔

عرصہ دراز تک آپ نے مسلسل رات دن کام کیا اور ہر ممکن صورت سے کہا۔ یہ نہیں کہ تھوڑے زمانے تک کام کر کے بیٹھ رہے جس وقت کہ حضرت نوحؑ کا بیٹا غرق ہو رہا تھا۔ تو آپ نے دعا کی

وَنَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ○ قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ○ قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَتَرْحَمْنِیْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ○

(سورہ ھود : ۴۵-۴۷)

ترجمہ:۔ نوحؑ نے اپنے پروردگار کو پکارا اور عرض کیا اے میرے پروردگار میرا بیٹا بھی میرے اہل و عیال میں داخل ہے۔ اور جو تو نے وعدہ فرمایا تھا وہ سچا ہے اور تو سب سے بڑا حاکم ہے۔ خدا نے فرمایا کہ اے نوح تمہارا بیٹا تمہارے اہل و عیال میں داخل نہیں۔ کیونکہ اس کے عمل اچھے نہیں تو جس چیز کی حقیقت کا تمہیں حال معلوم نہیں ہم سے اس کی درخواست نہ کرو۔ ہم تم کو سمجھائے دیتے ہیں کہ نادانوں کی سی باتیں نہ کرو۔ نوح علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں اس سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ تجھ سے ایسی چیز کی درخواست کروں کہ جس کی حقیقت حال مجھے معلوم نہیں ہے"

آپ کا بیٹا اور بیوی دونوں غرق ہوئے لیکن آپ نے یہ قربانی برداشت کی لوگوں نے آپ سے کہا۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ یٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِیْنَ۔ (سورہ الشعراء : ۱۱۵)

ترجمہ:۔ "وہ بولے۔ نوح! اگر تم اپنی حرکت سے باز نہ آؤ گے تو ضرور سنگسار کر دیئے جاؤ گے،

اور یہ کہا۔

مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُرِیْدُ اَنْ یَّتَفَضَّلَ عَلَیْكُمْ..... اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ۔

(سورہ المومنون : ۲۳-۲۴)

ترجمہ:۔ "یہ بھی تم جیسا آدمی ہے اور تم سے برتر ہونا چاہتا ہے۔ پس یہ ایک آدمی ہے جس کو جنون ہو گیا ہے"

لیکن آپ نے نہ کسی دھمکی اور نہ کسی طعنے کی پرواہ کی اور برابر کام میں مصروف رہے یہاں تک کہ آپ کے مخالف تباہ ہو گئے۔

قصہ حضرت موسیٰؑ

حضرت موسیٰؑ کے قصے کو ہم چند معجزات میں محصور کرتے ہیں اور اس پر بحث کرتے ہیں کہ آیا جس وقت حضرت موسیٰؑ نے بحیرہ قلزم عبور کیا تو معجزہ کی وجہ سے پانی پھٹ کر علیحدہ علیحدہ ہو گیا اور خشکی نکل آئی، یا معجزہ کچھ نہ تھا صرف مد و جزر تھا۔ اپنی ساری توجہ صرف انہیں باتوں میں صرف کرتے ہیں۔ حالانکہ اس میں تعلیم ہے۔ اپنی قوم کو انتہائی ذلت اور ظلم سے نکال کر ترقی کے اعلیٰ درجہ پر پہنچایا بنی اسرائیل ایسی حالت میں تھے کہ ان کے حاکم ان کے بیٹے ذبح کرتے تھے اور ان کی بیٹیاں اپنی خدمت کے لیے زندہ رکھتے تھے۔ نیز اس میں تعلیم ہے ان اوصاف کی جن کے ذریعہ سے ایسی ترقی

ممکن ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرماتا ہے کہ تم اور تمہارے بھائی (تم دونوں) فرعون کے پاس جاؤ۔

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۔

(سورہ طٰہٰ : ۴۳-۴۷)

ترجمہ :۔ ” تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اس نے بہت سر اٹھا رکھا ہے (غرض) اس کے پاس جاؤ اور جا کر کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ رخصت کر دے اور ان کو عذاب نہ دے “

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنی قوم کو گزشتہ ایام کی قوموں کے عروج و زوال کے حالات سے مطلع کرو۔ اس طرح ان کو متنبہ کرو۔

سورۃ ابراہیمؑ میں فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۔

(سورہ ابراھیم : ۵)

ترجمہ :۔ ” اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لاؤ اور ان کو خدا تعالیٰ کے دن یاد دلاؤ۔ کیونکہ ان میں ہر ایک صبر و شکر کرنے والے کے لیے نشانیاں ہیں “

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی کتاب کتاب الفوز الکبیر فی اصول التفسیر“ ص۳ میں تذکیر بایام اللہ کے یہ معنی درج فرمائے یعنی بیان وقائع کہ آں را خدا تعالیٰ ایجاد فرمودہ است از جنس انعام مطیعین و تعذیب مجرمین “

سورہ یونسؑ میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔

(سورہ یونس : ۸۷)

ترجمہ :۔ ” ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ مصر میں اپنے لوگوں کے رہنے کے لیے گھر بنالو اور اپنے گھروں کو مسجدیں قرار دو اور نمازیں پڑھو اور اے موسیٰ ایمان والوں کو خوشخبری دو۔ (کہ اب تمہاری نجات کا وقت قریب آ گیا ہے)

ایک مردہ قوم کو زندہ کرنے کے لیے ” گذشتہ اقوام کے عروج و زوال کی تاریخ اور کامیابی کی پوری امید“ جو کچھ کر سکتی ہیں اس کو اس زمانہ کی اقوام نے اچھی طرح سے محسوس کر لیا ہے۔

جس وقت فرعون کے ساحر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہو گئے تو فرعون نے ان سے کہا۔

فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ ۔ (سورہ طٰہٰ : ۷۱)

ترجمہ :۔ سو اب میں کٹواؤں گا تمہارے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں اور سولی دونگا۔ تو انہوں نے جواب دیا۔

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۔ (سورہ طٰہٰ : ۷۲)

ترجمہ :۔ جو کرنیوالا ہے کر گزر۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی اپنے اصول اور مقصد کی تکمیل کے لیے ہر قسم کی قربانی کے لیئے تیار تھے اس طرح ان کو کامیابی ہوئی اور ان کے دشمن تباہ ہو گئے۔ نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصّے میں قومی اتفاق پر بہت زور دیا ہے جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر گئے اور اپنا جانشین حضرت ہارون علیہ السلام کو کر گئے تو ان کی قوم میں گوسالہ پرستی شروع ہو گئی۔ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ حالت واپس آکر دیکھی تو نہایت ناراض ہوئے اور حضرت ہارون علیہ السلام سے فرمایا۔

قَالَ يَا هَارُونُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوا ○ اَلَّا تَتَّبِعَنِ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ۔ (سورہ طٰہٰ: ۹۱-۹۲)

ترجمہ :۔ "اے ہارون علیہ السلام جب تم نے ان کو دیکھا کہ یہ لوگ گمراہ ہو گئے تم کو کیا وجہ مانع ہوئی کہ تم نے میری ہدایت کی پیروی نہ کی کیا تم نے میری حکم عدولی کی یعنی جب وہ گمراہ ہو رہے تھے تو تم نے بزور ان کو کیوں نہ روکا تو حضرت ہارون علیہ السلام نے جواب دیا۔

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ ۔

(سورہ طٰہٰ : ۹۴)

"کہا اے میرے ماں جائے بھائی! میری ڈاڑھی اور سر کے بال تو نہیں پکڑو۔ میں اس بات سے ڈرا کہ تم واپس آکر یہ کہنے لگو کہ تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی۔"

یعنی حضرت ہارون علیہ السلام کو جب اپنی اصلاح کی کوششوں میں کامیابی نہ ہوئی تو انہوں نے اپنی قوم کی عارضی گمراہی کو پسند کیا۔ بجائے اس کے کہ آپ اس کو روکنے کے لیے ایسی پرزور کوشش کرتے جس سے قوم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

ایک پیغمبر نااتفاقی کے مقابلہ میں قوم کا عارضی گمراہی میں رہنا پسند کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک قوم متفق رہتی ہے اس وقت تک تعلیم وغیرہ اثر کر کے عمدہ نتائج پیدا کر سکتی ہے اور جب نااتفاقی سے قوم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں تو پھر وہ تباہ ہو جاتی ہے اور کسی طریقے سے کامیاب نہیں ہوتی۔

اب ظاہر ہے کہ قرآن کے ایک حصّے کے تو ہم نے معنی بدل دیئے، ایک حصّہ ہم نے بھلا دیا اور ایک حصہ کی تعلیم کو ہم نے کہانیوں کا درجہ دے رکھا ہے اور اس سے ہم مستفید ہونے کی کوشش نہیں کرتے تو پھر کونسی تعجب کی بات ہے کہ اب قرآن سے وہ نتیجے پیدا نہیں ہوتے جو ہونے چاہئیں اور جو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے زمانے میں ہو چکے ہیں۔

چوتھا باب

قرآنی تعلیم کو کمزور کرنے کی منظم سازش

اس موقعہ پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم کے کمزور ہونے کی جو کوششیں ہوئی ہیں۔ ان کے بارہ میں امام عبدہ مصری کی رائے نقل کی جائے۔ علامہ موصوف اپنی کتاب "اسلام والنصرانیت" میں صد ۱۴۳ پر مسلمانوں کے جمود اور اس کے اسباب کے متعلق بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اس کے بعد ایک خلیفہ نے سیاسی غلطی کی اور اسلامی احکام کی وسعت کے باعث اس کو اس امر کا موقعہ مل گیا۔ جس کو وہ اپنے خیال میں اپنے لیئے بہتر سمجھتا تھا۔ اس کو خیال ہوا کہ عربی لشکر ممکن ہے کہ علوی خلیفہ کا مددگار بن جائے کیونکہ علویوں کو نبوت کے گھرانے سے زیادہ تعلق تھا۔ اس نے ترک اور دیلم وغیرہ جیسے اجنبیوں کی ایک فوج تیار کی۔ اس فوج کی نسبت اس کا خیال تھا کہ وہ انہیں اپنی طاقت سے فرمانبردار اور اپنے احسان سے اپنا مطیع رکھ سکے گا۔ وہ سلطنت کے باغیوں کی مدد نہ کرے گی۔ اور جو طالب ملک ہیں ان کی مدد نہ ہوگی۔ اور اسلامی احکام کی وسعت اور سہولت نے اس امر کو اس کے لئے جائز رکھا اور اسلام بدل کر عجمی ہوگیا۔

ایک عباسی خلیفہ نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی ذات اور جانشینوں کے لئے بہتری پیدا کرے۔ اس طرح پر اس نے اپنی قوم اور مذہب کے لیئے برائی کی اس نے اجنبیوں کی فوج میں اضافہ کیا اور عجمی سرلشکر مقرر کئے۔ صبح سے شام نہ ہونے پائی تھی کہ یہ سرداران لشکر خلفاء پر قابض ہوگئے اور سلطنت خلفاء کے ہاتھ سے نکل کر عجمیوں کے قبضہ میں آگئی۔ ان لوگوں کو وہ عقل نہ تھی۔ جو اسلام سے پہنچ چکی ہو اور نہ وہ دل تھا جو مذہب سے مہذب ہو چکا ہو۔ یہ لوگ جہالت اور ظلم میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اسلام میں داخل ہوتے اور اسلام کو کپڑوں کی طرح اپنے جسم پر اوڑھ لیا۔ کوئی اثر اس کا ان کے وجدان میں نہیں پہنچا۔ ان میں سے اکثر لوگ اپنے معبودوں اور بتوں کو اپنے ساتھ لاتے تھے جن کی خلوت میں پرستش کرتے اور علانیہ طور پر اپنا اقتدار بڑھانے کی غرض سے باجماعت نمازیں ادا کرتے اس کے بعد تاتاریوں وغیرہ نے اسلام پر حملہ کیا اور بعض لوگ اس پر قابض بھی ہوگئے مگر یہ تمام علم کے شدید ترین حملے کے مقابلہ میں ہیچ تھے جو لوگوں کو ان کا مرتبہ تبلانے والا اور ان کے چال چلن کی خرابیوں کو ظاہر کرنیوالا ہے۔

انہوں نے علم اور اس کی دولت اسلام پر حملہ کیا اور اپنے مددگاروں کی جماعت کو آمادہ کیا۔ کہ وہ علماء کے زمرہ میں داخل ہو جائیں اور علم کا لباس پہن لیں اور اس علم میں شمار ہونے لگیں۔ اس کے بعد عوام الناس میں ایسی مذہبی باتیں پھیلائیں کہ علم سے ان کو نفرت ہو اور طلب علم سے ان کے نفوس میں بعد پیدا ہو۔ پرہیزگاری اور مذہبی جماعت

کے مدعی ہو کر یہ لوگ ان غافلوں میں داخل ہوئے اور دعوی کیا کہ مذہب ناقص تھا۔ ہم اس کو کامل کرنا چاہتے ہیں۔ یا وہ مریض تھا ہم اس کا علاج کرتے ہیں۔ یا منہدم ہونیوالا تھا۔ ہم اسکو سہارا دیتے ہیں یا جھک چکا تھا ہم اس کو سیدھا کر رہے ہیں۔

انہوں نے اپنے بت پرستی کے زمانے کی رسموں کو دیکھا اور نیز اپنے گرد وپیش کی دوسری قوموں پر نظر ڈالی اور اسلام کے لیئے ایسی باتیں عادت لیں۔ جن سے وہ بری ہے۔ لیکن وہ عوام الناس کو مطمئن کرنے میں اس طرح کامیاب ہوئے کہ یہ شعائر اسلام کی تعظیم ہے اور اس کے احکام کی۔

انہوں نے ہمارے لیئے یہ تمام محفلیں اور میلے ایجاد کیئے علما اور اولیاء وغیرہ کی عبادت ہمارے لئے مقرر کی۔ جس میں اسلامی جماعت میں تفرقہ پڑ گیا اور لوگ گمراہ ہو گئے۔ انہوں نے قرار دیا کہ متاخر کو سوائے اس کے جو متقدم کہہ چکا ہو اور کوئی بات کہنے کا حق نہیں یہ امر عقائد میں داخل کر لیا گیا تاکہ فکر ساکن اور عقول منجمد ہو جائیں اس کے بعد انہوں نے اپنے مددگاروں کو اسلامی ممالک کے اطراف میں بھیجا تاکہ وہ ایسے قصوں اور خبروں اور ایسے راویوں کی اشاعت کریں جس سے عوام الناس کو اطمینان ہو جائے کہ ان کو پبلک کاموں میں غور کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

جو کام قوم اور سلطنت سے متعلق ہیں۔ ان پر غور کرنا صرف حکام کا فرض ہو اور دوسرے آدمیوں کو ان میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جو شخص ان معاملات میں دخل دیتا ہے۔ وہ واہی ہے۔ مسلمانوں کے اعمال میں جو فساد اور ان کے حالات میں جو درہمی و برہمی پیدا ہو رہی ہے۔ وہ حکام کے کاموں کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ نتیجہ ہوتا ہے ان اخبار کا جو آخری زمانہ کی نسبت حدیثوں میں وارد ہوئے ہیں اور کسی تدبیر سے اصلاح حال و استقبال کی توقع نہیں ہو سکتی۔ بہتر یہ ہے کہ اس کو خدا کے سپرد کر دیا جائے۔ مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ صرف اپنی ذاتی حالت پر اقتصار کریں احادیث کے بعض ظاہری الفاظ سے ان کو اپنے اس مطلب کے لئے کچھ مدد ملے گی اور ضعیف حدیثوں اور موضوعات میں ان کو بہت سامان مل گیا جس سے ان اوہام کے پھیلانے میں ان کو بڑی تقویت ملی۔ ان گمراہ کرنے والوں کا ایک بڑا لشکر مسلمانوں میں پھیل گیا۔ شریر حاکموں اور والیوں نے تمام اطراف میں ان کی مدد کی۔ ارادوں کو پست کرنے اور ہاتھوں کو کاروبار سے روکنے کے لیئے قدر کا عقیدہ ایجاد کیا گیا۔ ان فزاخات کو قبول کرنے کے لیئے نفوس کو آمادہ کرنے والی سب سے بڑی محرک سادہ لوحی تھی اور مذہبی امور میں ضعیف بصیرت اور خواہشات کا اتباع یہ ایسے امور ہیں کہ جب جمع ہو جاتے ہیں تو مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح ہر حق باطل کی تاریکی میں چھپ گیا اور انسانی نفوس میں وہ عقائد راسخ ہو گئے جو دینی اصول کے بالکل او نجط مستقیم متضاد تھے۔ مسلمانوں کی آسمان سے باتیں کرنے والی امیدیں غارت ہوئیں اور ان کو مایوس کر کے بہائم کے درجہ تک پہنچا دیا۔ اس وقت جس کا نام اسلام رکھا جاتا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اسلامی اعمال نماز روزہ حج کی ظاہری صورتوں کا مجموعہ ہے۔ چند اقوال ہیں جن کے معانی میں تغیر و تبدل کر لیا گیا ہے اور جن کا نتیجہ وہ بدعتیں اور خرافات ہیں جنہوں

نے مسلمانوں میں اس جمود کی نوبت پہنچا دی ہے۔ جس کو میں نے بیان کیا ہے اور انہوں نے اس کو اسلام سمجھا ہے۔ مسلمانوں پر اس وقت اسلام کے نام سے جو عیب لگایا جاتا ہے اس کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ایک دوسری چیز ہے، جس کا نام انہوں نے اسلام رکھ لیا ہے۔ قرآن جس کی شان یہ ہے (کہ باطل نہ تو اس کے آگے سے ہی اس کے پاس پھٹکنے پاتا ہے اور نہ اس کے پیچھے کی طرف سے وہ حکمت والے تعریف کئے گئے۔ خدا کا اتارا ہوا ہے) اس بات پر شاہد ہے کہ وہ جھوٹے ہیں اور اس سے غافل ہیں اور اس کے احکام سے اعراض کرنیوالے ہیں۔

پانچواں باب

مذہب، مسلمانوں کی ترقی کا زینہ

ہمارے مذہب کی تو یہ حالت ہے اور ہماری مذہبی تعلیم اس طریقہ سے مسموم ہو چکی ہے تو پھر جب تک ہمیں صحیح مذہبی تعلیم نہ ملے ہم کیسے زندہ رہ سکتے ہیں؛ میرا عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا سنگ بنیاد مذہب ہے بغیر مذہب کے مسلمان ترقی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ حقیقی قومی ترقی کے لئے جس ایثار اور قربانی کی ضرورت ہے اس کے سنگ بنیاد صرف دو ہی چیزیں ہو سکتی ہیں اور تاریخ عالم شاہد ہے کہ ہمیشہ قوموں کی ترقی میں انہی دونوں سے کام لیا گیا ہے۔ یا تو "مذہب" یا "حب وطن" "مذہبی جذبہ کے مقابلہ میں "حب وطن" کا جذبہ مسلمانوں میں بہت ہی کمزور ہے اور اس لئے مسلمان صرف مذہب سے ہی متاثر ہو کر حقیقی ترقی کی شاہراہ پر قدم زن ہو سکتے ہیں۔

ہمارے نامور قومی مؤرخ اور شاعر (یعنی شبلی مرحوم) نے اسی مسئلہ کی توضیح کی ہے۔

تم کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو
دو ہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار

یا کوئی جذبۂ دینی تھا کہ جس نے دم میں
کر دیا ذرہ افسردہ کو ہم رنگ شرار

ہے یہ وہ قوت پر زور کہ جس کی ٹکر
سنگ خارا کو بنا دیتی ہے اک مشت غبار

جس کی زد کھا کے لرز جاتی ہے بنیاد زمیں
اس سے ٹکرا کے بکھر جاتے ہیں اوراق دیار

یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے بچے
کھیلنے جاتے تھے ایوان گہ کسریٰ میں شکار

وہ الٹ دیتے تھے دنیا کا مرقع دم میں
جن کے ہاتھوں میں رہا کرتی تھی اونٹوں کی مہار

اس کی برکت تھی کہ صحرائے حجازی کی سموم
بن گئی دہر میں جا کر چمن آرائے بہار

! یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے رہزن
: فاش کرنے لگے جبریل امیں کے اسرار

یا کوئی جذبہ ملک و وطن تھا جس نے
کر دیئے دم میں نوائے علمی بیدار

ہے اسی مٹی سے سرمستی احرار وطن
ہے اسی نشہ سے یہ گرمیٔ ہنگامہ کار

تجربہ بھی اس کا شاہد ہے کہ ہماری تمام قوم صرف مذہبی جذبہ سے متاثر ہو کر پوری طرح کام کر سکتی ہے۔ جب یہ حالت ہے تو یہ بات بدیہی ہے کہ قومی ترقی کے پروگرام میں سب سے اہم جزو صحیح مذہبی تعلیم ہونی چاہیئے۔ اگر صحیح مذہبی تعلیم کا انتظام نہ ہو گا۔ تو نہ مسلمان اپنی ہستی قائم رکھ سکیں گے اور نہ وہ ترقی کر سکیں گے۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ اب تک ہم سے یہ بھی نہیں ہو سکا ہے کہ سرکاری سکولوں اور کالجوں میں تو کیا خود اپنے قومی سکولوں اور کالجوں میں ہی قرآن مجید کی تعلیم کا انتظام کر لیتے۔

قرآن کی تعلیم سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ بغیر مطلب سمجھے قرآن مجید کے الفاظ دہرائے جائیں۔ مسلمانوں نے قرآن کی تعلیم کا کبھی یہ مطلب نہیں سمجھا۔ بعض حضرات سے اس کا ذکر کیا گیا تو فرمایا کہ ہمارے طالب علموں کو یونیورسٹی کا نصاب فرصت نہیں لینے دیتا۔ میں خود اس بات کو جانتا ہوں۔ لیکن جتنا وقت سینکڑوں مشن سکولوں اور کالجوں کے مسلمان اور ہندو طالب علم بائیبل کے لیئے دیتے ہیں کیا اتنا وقت قرآن کی تعلیم کے لیے ہمارے قومی سکولوں اور کالجوں کے طالب علم نہیں دے سکتے؟

مشن سکولوں اور کالجوں کے طالب علم باوجود بائیبل کے لیئے عموماً روزانہ وقت دینے کے امتحانات میں نہایت عمدہ طرح کامیاب ہوتے ہیں اور بائیبل کلاس کی وجہ سے کوئی شکایت سننے میں نہیں آتی۔ ایک تو وہ ہیں جو غیر مذہب کے طالب علموں کو روزانہ بائیبل پڑھاتے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ اپنے ہی قومی سکولوں اور کالجوں میں قرآن مجید کی تعلیم کے لیئے وقت نہیں نکال سکتے۔

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

علی گڑھ کالج کے تین طالب علم جو میرے دوست ہیں اتفاق سے سنٹرل انڈیا کے ایک مشن کالج میں تعلیم پانے کی غرض سے گئے۔ جب امتحان کا زمانہ قریب ہوا تو روزانہ اسباق بند ہو گئے۔ تاکہ طالب علم پوری طرح سے امتحان کے لیئے تیاری کر لیں۔ لیکن بائیبل کلاس روزانہ جاری رہی۔ خود پرنسپل صاحب بائیبل پڑھاتے تھے۔ ایک روز یہ تینوں حضرات پرنسپل صاحب کے پاس گئے کہ اب امتحان بہت قریب آ گیا ہے اور دوسرے تمام گھنٹوں میں سبق نہیں ہوتا ہے۔ صرف بائیبل کلاس کی وجہ سے ہمیں کلاس میں آنا پڑتا ہے برائے مہربانی اس کو بھی ملتوی

فرماد یجئے۔ تاکہ پوری طرح سے امتحان کے لئے تیاری کریں تو پرنسپل صاحب نے جواب دیا کہ

"یہ تمام عورتیں۔ تم سب طالب علم اور میں اور تمام پروفیسر فقط اسی گھنٹہ کی بدولت یہاں موجود ہیں۔ اگر یہ گھنٹہ نہ ہو تو یہ کالج بھی نہ ہو۔"

اگر ہم صرف اس واقعہ کی تقلید کر سکیں تو پھر بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اپنے طالب علموں کو قرآن مجید کی تعلیم تو دی نہیں جاتی اور ستم یہ ہے کہ ان سے توقع کی جاتی ہے کہ ان کے ذریعہ سے قوم کو ترقی ہو، عروج ہو یہ ہو وہ ہو اور اگر ان بیچاروں سے کچھ نہیں ہو سکتا تو پھر ان پر نکتہ چینیاں کی جاتی ہیں۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ
باز میگوی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

سخت ضروری ہے کہ کم از کم اپنے قومی سکولوں اور کالجوں میں تو بہت جلد قرآن مجید کی صحیح تعلیم کا انتظام کیا جائے قرآن مجید کی تعلیم کے انتظار میں سب سے اہم حصہ عمدہ پروفیسروں کا تیار کرنا ہے اور ان کا انتخاب ہے اور اس بارے میں آگرہ کانفرنس ۱۹۱۳ء کے لیکچر میں جو کانفرنس کی رپورٹ میں شائع ہو چکا ہے۔ میں کافی بحث کر چکا ہوں جب قرآن مجید کی تعلیم کا انتظام ہو چکے تو اس کے بعد قومی ترقی کا نام لینا جائز ہو گا۔

خدا تعالیٰ ہم کو صحیح راستہ پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین ثم آمین

قرآنی مطالعے کے بنیادی اصول

حصہ دوئم ——— قرآنِ شریف کا مقدمہ

فوائد از حجۃ اللہ البالغہ از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ

فائدہ ① نبی کس کو کہتے ہیں؟

جاننا چاہیئے کہ مُفہمین (یعنی وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہی کی حقیقت سمجھائی ہے) کے بہت سے اقسام ہیں اور ان کی لیاقتیں اور قابلیتیں بھی جُدا جُدا ہیں انہی میں سے اللہ تعالیٰ نوعِ انسان کیلئے رہبر اور رہنما مقرر کرتا ہے جب اللہ کی حکمت یہ چاہتی ہے کہ ان میں سے ایک کو اپنی مخلوق کی طرف بھیجے اور اس کو لوگوں کو تاریکی میں سے نکال کر روشنی کی طرف آنے کے لئے سبب بنائے تو لوگوں پر یہ فرض کرتا ہے کہ دل اور جان سے اس کی تابعداری کریں اور اسی کے لئے اس دنیا سے باہر کی مخلوق یعنی ملائکہ کی اونچی جماعت میں یہ تجویز پاس کی جاتی ہے کہ جو آدمی اس کی تابعداری کرے گا اس سے ملائکہ راضی ہوں گے اور جو اس کی مخالفت کرے گا اس کے دُشمن ہو جائیں گے اور اس پر لعنت کرتے رہیں گے، جب اللہ کا یہ فیصلہ ہوتا ہے تب اللہ تعالیٰ اس دنیا کے رہنے والے انسانوں کو اس بات کی خبر دیتا ہے اور ان پر اس بھیجے ہوئے انسان کی تابعداری کرنا لازم ٹھہراتا ہے۔ اس بھیجے ہوئے بزرگ کو جس کی تابعداری کرنا لوگوں پر لازم ہے نبی کہا جاتا ہے۔

فائدہ ② اللہ والوں کے اقسام

اُوپر گزر چکا ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہی کی حقیقت سمجھائی ہے ان کے بہت سے اقسام ہیں۔ پھر ان میں سے کوئی کامل ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کی حقیقت سمجھنے میں کمال کو پہنچ چکا ہے یہی نبی کی شان ہے) کوئی حکیم ہے (یعنی اللہ کی بادشاہی میں جو حکمت رکھی ہوئی ہے وہ اسکو سمجھتا ہے) کوئی مؤید بروح القدس ہے (یعنی انسانیت کو کمال تک پہنچانے کے لئے جو کام اس پر رکھا ہُوا ہے یا اس نے اپنے اوپر لیا ہے اس میں اس کی مدد روح القدس سے ہوتی رہتی ہے) کوئی لوگوں کو راستہ دکھانے والا اور ان کو پاک کرنیوالا ہے کوئی امام (یعنی قوموں کا رہنما) ہے کوئی مُنذر (یعنی کاموں کے نتائج کی پہلے سے خبر دینے والا) ہے۔

فائدہ ③ سب سے بڑا نبی کون ہے؟

انبیاء میں سب سے بڑی شان والا وہ نبی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے ساتھ دوسری اقوام کیطرف بھی نبی بنا کر بھیجا ہو۔ پھر وہ نبی ① اپنی قوم کو اندھیروں میں سے روشنی کیطرف نکالنے کا سبب ہوگا ② اور اس کی قوم دوسری قوموں کی رہنما بنے گی، یہ دونوں باتیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہیں۔ پہلی بات کیطرف سورۂ جمعہ کی دوسری اور تیسری آیت میں ارشاد ہے ان دونوں آیتوں کے معنی یہ ہیں، ”اللہ وہ ہے جس نے ان پڑھوں میں ان میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور عقلمندی سکھاتا ہے اور بیشک وہ اس سے پہلے ظاہر گمراہی میں تھے اور ان میں سے دوسروں کے لئے بھی (اسکو بھیجا ہے) جو اب تک اُن (پہلوں سے) نہیں ملے اور وہ زبردست حکمت والا ہے۔“ دوسری بات کی طرف سورۂ آل عمران کی ایک سو دسویں آیت میں اشارہ ہے اس آیت کے معنی یہ ہیں ”تم اچھے کام کا حکم کرتے ہو اور بُرے کام سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔ اگر کتاب والے ایمان لاتے تو ان کے لیے بہتر تھا۔ کچھ ان میں سے ایمان والے ہیں اور بہت سے ان میں سے نافرمان ہیں“ اور مندرجہ ذیل احادیث میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے۔

حدیث، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو (لوگوں کے لیے) آسانی پیدا کرنیوالا بنا کر بھیجا ہے اور (ان پر) تنگی کرنیوالا بنا کر نہیں بھیجا (یعنی اُمت محمدی کے افراد بھی انسانوں کی ہدایت کے لئے اس طرح بھیجے ہوئے ہیں جس طرح انبیاء کو بھیجا جاتا ہے)

علاوہ اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں علم کے وہ سب اقسام موجود تھے جو جدا جدا ان لوگوں میں موجود ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بادشاہی کی حقیقت سمجھائی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء تھے ان میں سے کسی کو ایک قسم کا علم تھا۔ کسی کو دو قسموں کا، لیکن علم کے تمام اقسام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دوسرے کسی میں بھی نہ تھے۔ (یعنی انبیاء، حکماء اور جن کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید ہوتی ہے۔ رہنما اور اماموں کو خلفاء بھی جدا جدا علم ہے، علم کے وہ سب اقسام ہمارے نبی کو حاصل ہیں)

فائدہ ④ نبیوں کو انبیاء بنا کر کیوں بھیجا جاتا ہے؟

یہ بھی جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت رسولوں کو بھیجنے کی تب خواہش کرتی ہے جب رسولوں کے

بھیجنے میں کسی قسم کی بھلائی ہو اس بھلائی کو اللہ غیب دان کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا۔ لیکن بعض اسباب ایسے بھی ہیں جن کو ہم بھی جانتے ہیں۔ وہ اسباب رسولوں کے بھیجنے کے وقت ضرور پائے جائیں گے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ وقت کسی نئی حکومت کے ظاہر ہونے اور پہلی حکومت کے برباد ہونے کا ہوگا پھر اس وقت اللہ تعالیٰ ایسا رسول بھیجے گا جو اس نئی حکومت کا دین یا قانون قائم کرے گا اور پرانی حکومت برباد ہوگی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام کے لئے نبی بنا کر بھیجا ہے۔

فائدہ ۵ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا کر بھیجنے کی حکمت

جب ہر قوم کا دین اور دھرم جدا ہو گیا اور ہر ایک قوم نے خاص طریقے اختیار کر لئے اور ان عادات اور طریقوں کو قائم رکھنے کے لئے دوسری قوموں کے ساتھ پہلے زبان کے ساتھ انہوں نے جھگڑے کئے اور اس کے بعد اپنے مخالفین پر غالب آنے کے لئے اپنے ہتھیار اٹھا کر ان سے جنگ بھی کی اور ان میں ظلم پھیل گیا، اور کتنے کام جو ان کو کرنے تھے ان کو انہوں نے چھوڑ دیا اور ہر جماعت نے دوسری جماعت پر لعنت کی، اور ان کو برا سمجھ کر ان کے ساتھ جنگ جاری رکھی اور قوموں کے آپس کے جھگڑے کے سبب حق چھپ گیا۔ تب ایک راہ راست پر چلنے والے امام یا پیشوا کی ضرورت پڑی جو تمام جماعتوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرے جیسا حق پر چلنے والا خلیفہ (اللہ کا نائب) ظالم بادشاہوں کے ساتھ کرتا ہے (یعنی یہ پیشوا مختلف جماعتوں کو ملا کر ایک جماعت بنائیگا۔ یہ امام (پیشوا) جو جدا جدا جماعتوں کو ملا کر ایک جماعت بنائے گا۔ اس کو چند اصولوں پر چلنا ہوگا۔ ان اصولوں میں سے پہلا اصول یہ ہے کہ وہ ایک قوم کو راہ راست کی طرف بلائے گا اور ان (کے اخلاق) کو پاک کرے گا اور ان کی حالت درست کرے گا۔ اس کے بعد ان سے ایسا کام لے گا جیسا اپنے اعضاء سے لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ ان کو لوگوں کی ہدایت کے لئے جدا جدا ملکوں میں بھیج دے گا اور سیدھے راستے پر نہ چلنے والی دنیا سے جنگ بھی کریگا۔ یہ تیسرے فائدہ میں بیان کی ہوئی آل عمران کی آیت ۱۱۰ کے معنی ہیں۔

اس پہلے اصول پر امام کو اس لئے چلنا پڑے گا کہ اس اکیلے امام (پیشوا) سے دنیا کی بے شمار جماعتوں کے ساتھ مقابلہ نہ ہو سکے گا۔ اور گمان بھی یہ ہے کہ سیدھے راستے پر چلانے کے لیے جنگ کے پورے ساز و سامان اور پوری فوج کے سوا جس کے حاصل کرنے کے لئے نبی (امام) کی عمر کافی نہیں ہے) دوسری جماعتیں تابعداری قبول نہیں کریں گی، جیسے کہ اس وقت کے موجودہ ادیان والوں (یہود، عیسائی اور مسلمانوں) کے شروع زمانہ میں ہو چکا کیونکہ ان میں سے جو لوگ ابتداء میں اپنے اپنے انبیاء پر ایمان لائے وہ بالکل تھوڑے تھے، اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ طاقتور ہوئے اور اقوام کی ہدایت کا سبب بنے اور حق کے لئے انہوں نے لڑائیاں کیں۔

فائدہ ⑥ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ملک کی حالت

اور آپ نے اُسے کیسے بدلا؟

جن ملکوں کی آب و ہوا معتدل ہے (جس کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کا مزاج بھی معتدل ہے) وہ ملک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے وقت دو بڑے بادشاہوں کے قبضہ میں تھے۔

۱۔ کسریٰ (ایران کا بادشاہ) جس کا عراق، یمن، خراسان اور ان ملکوں کے ارد گرد والے ملکوں پر قبضہ تھا، ماوراالنہر سندھ اور ہندوستان کے بادشاہ بھی اس کے ماتحت تھے اور ہر سال اسکو خراج دیتے تھے۔

۲۔ قیصر (روم یا یورپ کا بادشاہ) جس کا شام، روم اور ان ملکوں کے ارد گرد والے ملکوں پر قبضہ تھا۔ مصر، مغرب اور افریقہ کے ملک بھی اس کے ماتحت تھے اور ہر سال اس کو خراج دیتے تھے۔ پس ان دونوں بادشاہوں کو شکست دینے اور ان کے ملکوں پر غالب آنے کے یہ معنی ہوں گے کہ جس نے ان کو شکست دی ان کا تمام دنیا پر غلبہ ہو گیا (اُمتِ اسلامیہ نے خلیفہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ان دونوں حکومتوں کو فتح کر کے گویا روئے زمین کو اپنے قبضہ میں کر لیا) اس کے علاوہ ان دونوں بادشاہوں کی عیش و عشرت کی عادات ان کے ماتحت ملکوں میں پھیل گئی تھیں۔ پس ان عادات کے بدلنے اور ان عادات سے لوگوں کو روکنے کے یہ معنی ہوں گے کہ گویا تمام ملکوں کو خبردار کیا جاتا ہے، کہ ان عادات کو چھوڑ دیں ورنہ ان میں تباہی آئے گی)

لیکن جن ملکوں کی آب و ہوا اور وہاں کے لوگوں کا مزاج معتدل نہیں ہے ان کا انسانی نوع کی اصلاح میں کوئی خیال نہیں کیا گیا ہے۔

پس جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ اس ٹیڑھے راستہ کو سیدھا کرے اور لوگوں کے لئے ایک ایسی جماعت (اُمتِ اسلامیہ) پیدا کرے جو اچھے کام کا حکم کرے اور بُرے کام سے روکے اور ان کے بگڑے ہوئے رسم و رواج کو بدلے تب یہ بات اس پر موقوف ہوئی کہ قیصر و کسریٰ کی حکومت برباد کی جائے اور ان کی پیدا کی ہوئی بُری عادتوں کو درست کیا جائے کیونکہ ان کی پیدا کردہ حالت نے معتدل مزاج والے ملکوں میں گہرا اثر کیا تھا۔ اس لیے ان دونوں بادشاہوں کی بادشاہی کے برباد ہونے کا اللہ تعالیٰ کیطرف سے فیصلہ ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی کہ کسریٰ برباد ہو گا اور اس کے بعد کوئی بھی کسریٰ پیدا نہ ہو گا اور قیصر برباد ہو گا اور اس کے بعد کوئی دوسرا قیصر پیدا نہ ہو گا۔ اور تمام دنیا کے باطل کو مٹانے والا حق (قرآن کریم) اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ عرب کے باطل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے صحابہ کے ہاتھوں سے مٹائے گا۔ اور عرب کے ہاتھوں سے قیصر اور کسریٰ کے باطل کو مٹائے گا اور باقی ملکوں کے باطل کو ان دونوں بادشاہوں کے

رہنے والوں کے ہاتھوں سے مٹائے گا۔

مہاجرین اولین اور انصار سبب بنے قریش اور قریش کے اردگرد رہنے والوں کے اسلام میں داخل ہونے کا پھر ان کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ نے عراق اور شام فتح کرایا، اس کے بعد عراق اور شام والوں کے ہاتھوں سے اللہ تعالےٰ نے فارس اور روم فتح کرایا، پھر ان کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ نے ہندوستان، ترکستان اور سوڈان فتح کرایا۔ گویا کہ یہ کام ایک مکان کی طرح ہے جو دیواروں پر کھڑا ہوتا ہے اور دیواریں بنیادوں پر کھڑی ہوتی ہیں۔

مذکورہ بالا چھ فوائد سے رسولوں کے بھیجنے کی حکمت بھی سمجھ میں آگئی ہوگی اور یہ بات بھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے جو نتیجہ ظاہر ہوا وہ قرآن پر عمل کرنے سے ہوا۔ پس اس تمام نتیجہ کو قرآن کی تعلیم کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے اور اس نتیجہ کے پیدا کرنے کے لئے قرآن کو نازل کیا گیا ہے (یہ چھ فوائد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ سے لئے گئے ہیں، پہلے چار فوائد باب حقیقۃ النبوۃ وخواصہا ص۸۴ ج ۱ میں سے اور آخری دو فوائد ص۱۶۲ ج ۲ سے لئے گئے ہیں)۔

فوائد متفرقہ فرمودہ حضرت استاذ مولانا عبید اللہ سندھیؒ

فائدہ ① رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا اصل کیا تھا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعویٰ کیا کہ آپ خود ابراہیمی ملت کو ان کے فرزند اسمٰعیل علیہ السلام کے طریقہ پر زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام گزر چکے تھے اور وہ بھی ابراہیمی ملت کو زندہ کرنا چاہتے تھے لیکن اسرائیل (یعقوب) بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ پر۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ہمیشہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر پڑتی تھی جیسا کہ قرآن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ○ (یعنی بے شک ہم نے تمہاری طرف ایک گواہی دینے والا رسول بھیجا ہے جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا) اس آیت میں مذکورہ بالا بات کی طرف اشارہ کیا ہوا ہے۔

تمام شریعتوں کا اصل حظیرۃ القدس (اس جہان کا انتظام کرنے والی مقدس مجلس) میں موجود ہے۔ پس جن بزرگوں کا تعلق حظیرۃ القدس سے ہے وہ ہر شریعت کو وہاں سے معلوم کر سکتے ہیں۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو وہاں سے معلوم کرتے تھے۔

فائدہ ② رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی اقوام تک دینِ حنیفی کی کیسے تبلیغ فرمائی؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے سوا تمام دنیا کو اس طرح دعوت دی اور ارشاد فرمایا کہ توراۃ اور قرآن کی تعلیم ایک ہی ہے اگر تم کو ان دونوں کتابوں میں سے کسی کتاب کی تعلیم پر اعتراض ہے تو تم ان دونوں کتابوں جیسی تعلیم پیش کرو۔ اگر تمہاری تعلیم توراۃ اور قرآن کی تعلیم سے زیادہ رہنما ثابت ہوئی تو میں اس کی تابعداری کروں گا۔

لیکن خاص عرب قوم کو صرف اکیلے قرآن کی تعلیم کی دعوت دیتے تھے، قرآن اور توراۃ کی تعلیم کے بارے میں قرآن نے جو اعلان کر رکھا ہے اس کو سورۃ المائدہ کی آیات ۴۴ سے ۵۰ تک دیکھنا چاہیئے۔

فائدہ ③ دینِ حنیفی کی دوسرے ادیان سے برتری

حضرت استاذ مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ اس وقت مسلمانوں کے سوا زمین میں جتنی بھی جماعتیں موجود ہیں ان میں سے ایک حنیفی (یعنی یہودی اور عیسائی) ہیں جن کے پاس تورات ہے دوسرے صابی ہیں، پھر صابی مذہب والوں کے کئی اقسام ہیں (۱) ایران کے مجوسی، جن کے پاس زردشت کی کتاب ہے (۲) ہندو
ہندو دھرم والوں کی پھر دو جماعتیں ہیں (۱) برہمن جن کے پاس وید ہیں (۲) سمنی، جن کے پاس بدھ کی نصیحتیں اور احکام ہیں۔ برہمنوں کی مثال ہمارے پاس یہودیوں جیسی ہے اور بدھ دھرم والوں کی مثال عیسائیوں کی طرح ہے۔ حنیفی اور صابی مذہب والوں کے سوا تیسرے وہ لوگ ہیں جو عقل اور فکر سے سوچی ہوئی باتوں پر چلتے ہیں۔ جن کا مرکز یونان اور روم ہے۔ انہوں نے جب کبھی کوئی بادشاہی قائم کر کے قوم کو اکٹھا کیا ہے اور اس لیے ان کو دنیا کے قوانین میں سے کسی اونچے قانون کی ضرورت پڑی ہے تو انہوں نے اہل کتاب کے قانون میں سے جو قانون ان کی رائے کے مناسب ہوا ہے اس کو لیا ہے اور اس کے بعد یا تو کسی (ڈکٹیٹر) بادشاہ کی طاقت سے مدد لی ہے یا آسمانی ادیان میں سے کسی دین کی طرف انہوں نے رجوع کیا ہے اس طرح انہوں نے اپنی عقل سے کام لیا ہے۔ زردشت ایرانیوں کی کتاب اور وید اور بدھ دھرم والوں کی کتاب یہ سب کتابیں توراۃ کے درجہ کو کبھی نہیں پہنچ سکتیں۔ اس بات کو مذکورہ بالا مذاہب والے بھی مانتے ہیں۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا جماعتوں میں سے کسی جماعت کے پاس بھی تورات جیسی کتاب نہیں

ہے۔ جس میں انبیاء سے لیا ہوا قانون اکٹھا کیا ہوا ہو۔

فائدہ ④ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے امام کا خطاب کیوں ملا؟

ابراہیم علیہ السلام کا دین کسی زمین یا کسی قوم کے ساتھ خاص نہ تھا بلکہ روئے زمین کے ہر نوع انسان کے لئے تھا۔ ابراہیم علیہ السلام کے بعد کوئی بھی ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا جس نے ابراہیم علیہ السلام کی طرح تمام نوع انسانی کے فائدہ کے لئے کوئی عام فکر پیش کیا ہو۔ یہ معنی اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ہیں اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (یعنی اے ابراہیمؑ! میں تجھ کو لوگوں کے لئے امام بنانیوالا ہوں)

فائدہ ⑤ حنیفی ملّت کی اصلی رُوح

ابراہیم علیہ السلام کے دین کی اصلی روح یہ تھی کہ کسی شخص کی کسی بھی جماعت پر بادشاہی نہ ہو اور کوئی چیز بھی مخلوقات میں سے خدا نہیں بن سکتی، اس عقیدہ کو ہی توحید کہا جاتا ہے۔ یہ ایسا فکر ہے کہ جس کو ہر ایسا شخص پسند کریگا جس کی انسانیت اور عقل سلامت ہوں گے کیونکہ کوئی بھی انسان نہیں چاہتا کہ اپنے جیسے انسان سے دھوکا کھا جاوے اور اس کا زیر دست ہو کر رہے بلکہ ہر ایک انسان ایسی بات کو پسند کرتا ہے جس میں مشورہ لیا گیا ہو اور اس مشورہ میں اس کو بھی دخل ہو، یہ گویا کہ انسانی فطرت ہے۔

اس کے سوا بڑے سمجھدار لوگوں کے پاس یہ بھی ثابت ہے کہ اس جسمانی جہان کے پردہ کے پیچھے اور دوسری ذات بھی ہے جس کے لازمی صفات کی خواہش کی بناء پر یہ جہان پیدا ہوا ہے وہ ذات انسانی حواس کے سمجھنے سے بالکل دُور ہے۔ اس لئے ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ جس چیز کو اپنے حواس سے معلوم کر سکے، اس کو اللہ کا درجہ نہ دے کیونکہ اللہ حواس کے سمجھ سے بالکل باہر ہے، پس جو بھی انسان آنکھوں اور دوسرے حواس سے معلوم کی ہوئی مخلوق کو اللہ کر کے نہ سمجھے گا تو وہ اللہ کے خاص بندوں میں سے ہے۔

فائدہ ⑥ یہودی اور عیسائی اگرچہ حنیفی ملّت کی شاخیں ہیں لیکن انہوں نے اس کی پُوری تبلیغ نہیں کی

پانچویں فائدے میں بیان تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعوت تمام روئے زمین کے انسانوں کے لئے تھی لیکن

یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ دعوت آپ کی زندگی میں انسانیت کے تمام اقسام تک پہنچ سکی، پس آپ نے دُعا مانگی کہ کاش کہ اللہ تعالیٰ اس کو اولاد دے جن کے لیے ایک مرکز قائم کرے اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی اولاد کی طرف سے آپ کے فکر (یعنی دعوت) کو انسانوں کے تمام اقسام تک پہنچایا جائے، اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی یہ دُعا قبول کی اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ دو فرزند عطا فرمائے، ان کے لئے آپ نے دو تبلیغی مرکز قائم کئے اسحٰقؑ کے لئے بیت المقدس کی مسجد اور اسمٰعیلؑ کے لیے مکہ شریف کی مسجد الحرام

پھر جو بھی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے بلند خیال والا پیدا ہوا

تمام اقسام تک پہنچا دے اور خود قوموں کا امام (پیشوا) بنے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام بھی ان بلند خیال والے انسانوں میں سے ایک بڑے پیغمبر تھے۔ انہوں نے یہ کوشش کی لیکن وہ بھی کام کو پورا نہ کر سکے، کیونکہ ان کی قوم نے جسے آپ نے ابراہیمی ملت کی اشاعت کے لیئے اپنا مددگار بنایا تھا۔ اس کی پوری تابعداری نہ کی۔ اس لئے کام ادھورا رہ گیا، یعنی موسیٰ علیہ السلام کی یہ مرضی تھی کہ اپنی قوم کو مصر کے ملک سے نکال کر بیت المقدس میں بسائیں اور وہاں اپنا مقصد پورا کرنے کے لیئے ایک ادارہ قائم کریں لیکن آپ بیت المقدس تک پہنچے ہی نہیں کہ راستے میں فوت ہو گئے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل میں موسیٰ علیہ السلام جیسا بلند ہمت والا دوسرا کوئی بھی پیدا نہیں ہوا جو ان کے چھوڑے ہوئے کام کو پورا کر سکے۔

موسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسیٰ علیہ السلام آئے اور انہوں نے ارادہ کیا کہ خود موسیٰ علیہ السلام کا قائم مقام بن کر ابراہیمی دعوت کو انسانوں کے تمام اقسام تک پہنچا دے لیکن یہود نے اس بات کو قبول نہیں کیا۔

اس کے بعد عیسےٰ علیہ السلام نے فقط ایک تبلیغی جماعت تیار کی جو ابراہیمی دعوت کو تمام اقوام تک پہنچاتی رہے جیسے ہمارے اساتذہ حضرت امام شاہ ولی اللہؒ کے اتباع (پیرو) انگریزی حکومت کے زمانہ میں فقط دین کی تبلیغ کرتے تھے، عیسیٰ علیہ السلام کی تیار کردہ جماعت کی کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ مشرقی رومی سلطنت نے عیسائی مذہب قبول کر لیا اور اس نے وہ کام کر دکھایا جس کی یہود کو توفیق نہ ہوئی۔

یہودیوں نے بھی ابراہیمی طریقہ پر ایک ادارہ قائم کیا لیکن وہ محض اپنی قوم کے لئے تھا، دوسرے انسانوں سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی ان کا مقصد فقط یہ تھا کہ وہ خود ابراہیم علیہ السلام کے دین پر چلیں گے اور جو شخص ابراہیم علیہ السلام کے دین کی دوسری اقوام میں تبلیغ کرتا اسے دشمن سمجھتے اور اسکو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے۔

عیسیٰ علیہ السلام نے پہلے یہود کو ابراہیمی ملت کی روح سمجھائی لیکن جب ان سے ناامید ہو گئے تو اپنے حواریوں کی ایک جماعت تیار کی اور ان سے یہ عہد لیا کہ وہ ابراہیمی ملت کی روح کو تمام اقوام میں پھیلا دیں گے

اب ابراہیمی ملت پر چلنے والوں کے دو مذہب قائم ہو گئے۔ (۱) یہودی جنہوں نے ابراہیمی دعوت کو بنی اسرائیل کے ساتھ ہی مخصوص کر دیا (۲) عیسائی جنہوں نے ابراہیمی دعوت کو دوسری اقوام تک بھی پہنچایا۔ لیکن سالہا سال کے بعد عیسائیوں نے بھی ابراہیمی ملت کی روح کو تو چھوڑ دیا، بلکہ اس کی صورت کو بھی بگاڑ دیا۔

فائدہ ⑦ حنیفی ملّت کی پوری پوری تبلیغ کون کرے گا

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اس کی اولاد میں سے ایک نبی پیدا ہو گا جو ان کی ملت کو دنیا کے کونے کونے میں پھیلا دے گا۔ ابراہیم علیہ السلام کو اس وعدہ پر پورا بھروسہ تھا اور یہ بھی یقین تھا کہ وہ بنی اسماعیل کی اولاد میں سے پیدا ہو گا۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام کو اللہ کے حکم سے ایسی زمین میں بسایا جہاں کوئی کھیتی نہیں ہوتی کیونکہ کھیتی کرنے والے لوگوں کو ہمیشہ اپنے سرسبز وطن پر فخر رہتا تھا اور وہ اپنے وطن والوں کو جُدا قوم سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد اگر وہ اس وطن والے کسی خاص آدمی کی اولاد ہوں گے تو وہ اپنی نسل پر بھی اترائیں گے اور دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھیں گے اور ان میں اپنے خیالات کی تبلیغ کرنے سے رُک جائیں گے، کھیتی والے ملکوں کے باشندوں کو دیکھا گیا ہے کہ ان کے باپ دادا کی اولاد اگر دوسرے ملک میں بستی ہے اور ان کے ساتھ کسی بات پر جھگڑا ہو جائے تو وہ اپنے بھائیوں کے فائدہ کو اپنے وطن کے مفاد پر کبھی ترجیح نہیں دیں گے۔ اسی طرح اگر ایک جماعت کی بنیاد چند سچے اعتقادات پر قائم ہو اور اس جماعت کا ایک حصہ جُدا ہو کر کسی بڑے مالدار ملک میں آباد ہو جائے تو وہ حصہ اپنے مذہب والوں کی مصلحت کا اس وقت کبھی خیال نہیں کریگا جب ان کے مذہب کی مصلحت ان کے وطن کی مصلحت سے مخالف ہو گی ابراہیم علیہ السلام کا اپنے بیٹے اسماعیل کو ایک بیابان میں بسانے سے یہی مقصد تھا کہ اس کی اولاد میں وطن کی محبت پیدا نہ ہو بلکہ اپنے مذہب کو ہر حالت میں مقدم رکھتے آئیں۔

یہ بھی آپ کو معلوم تھا کہ جس بیٹے کا اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ وعدہ کیا تھا جو اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہو گا۔ وہی ان کی ملت کو تمام دنیا میں پھیلانے میں کامیاب ہو گا۔ اسی لئے اسماعیلؑ کو حجاز کے بیابان میں رہنے کا حکم دیا۔ اس کے علاوہ ابراہیم علیہ السلام یہ بھی جانتے تھے کہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے سوا بہت سے لوگ اس مقصد کے لئے کوشش کریں گے لیکن وہ کامیاب نہیں ہوں گے کیونکہ وہ مالدار ملکوں کے باشندے بنیں گے۔ پس ان میں کسی نہ کسی قسم کا تمدن آئیگا، پھر دوسرے لوگ جن کا تمدن بھی انہی کی طرح ہو گا کبھی برداشت نہ کریں گے کہ ان کے تابعدار ہو کر رہیں اور وہ ان سے برتر و بلند رہیں، اسی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام اپنے مقصد تک نہ پہنچ سکے۔

فائدہ ⑧ — عیسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی کہ حنیفی دین کی پوری تبلیغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے

عیسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ یہودی، ابراہیمی ملّت کو تمام اقوام میں پھیلا دینے کی کوئی کوشش نہیں کرتے تو ان سے ناامید ہو گئے لیکن پہلی کتابوں سے ان کو معلوم تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے جو مرد خدا اس کے دین کو تمام اقوام میں عام کریگا وہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے پیدا ہو گا۔ اس لئے انہوں نے ایک پیغمبر کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی اور فرمایا کہ جس کام کے کرنے کا میں نے ارادہ کیا تھا اس کو وہ آکر پورا کرے گا اور اپنے حواریوں کو بھی وصیت فرمائی کہ جب اس کا ظہور ہو تو تم اس کی تابعداری کرنا، لیکن عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کی مخالفت کے پیش نظر اس بات کو صاف اور واضح الفاظ میں بیان نہیں فرمایا بلکہ مختلف اوقات میں علیحدہ علیحدہ موقعوں پر حسب ذیل ارشاد فرمایا۔

۱۔ میں اپنے رب سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا۔ کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے (یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۶)

۲۔ میں تمہیں یتیم نہ چھوڑوں گا، میں تمہارے پاس آؤں گا۔ (یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۸)

۳۔ میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں لیکن مددگار (یعنی روح القدس) جسے رب میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا۔ (یوحنا باب ۱۴ آیت ۲۵)

۴۔ اب میں اپنے بھیجنے والے کے پاس جاتا ہوں اور تم میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا کہاں جاتا ہے؟ بلکہ اس لئے کہ میں نے یہ باتیں تم سے کہیں تمہارا دل غم سے بھر گیا۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار کو پوری سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دیں گا۔

وہ میرا جلال ظاہر کرے گا اس لئے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا جو کچھ رب کا ہے وہ سب میرا ہے اس لئے میں نے کہا کہ وہ مجھ ہی سے حاصل کرتا ہے اور تمہیں خبر دے گا۔ تھوڑی دیر میں تم مجھے نہ دیکھو گے اور پھر تھوڑی دیر میں تم مجھے دیکھ لو گے۔ (انجیل یوحنا باب ۱۶ آیت ۵)

عیسٰی علیہ السلام کی ان تمام بشارتوں سے یہ بات ظاہر ہے کہ یہ تمام بشارتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے متعلق ہیں۔ ان بشارتوں کے علاوہ انبیاء سابقین کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کے بارے میں بہت سی بشارتیں موجود ہیں۔ یہود ان بشارتوں کو دیکھ نہیں سکتے اس لئے انہوں نے ان پیشگوئیوں کے غلط معنی بیان کر کے بگاڑ دیا ہے تاکہ لوگ ان کے صحیح معنی سمجھ نہ سکیں لیکن وہ اللہ کی صحیح بات کو بدل نہیں سکتے۔ جو شخص بھی توراۃ اور انجیل کو فکر سے پڑھے گا وہ حق کو سمجھ جائے گا اور جو کچھ ان سرکشوں نے لکھا اسے چھوڑ دیگا۔

فائدہ ⑨ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہو کر آنے کا اصلی مقصد

ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کا یقین تھا اور عیسٰی علیہ السلام نے بھی آپ کے آنے کی خوشخبری دی تھی، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کا مقصد متعین ہو جاتا ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں ایک زبردست حکومت کریں گے جس کا مقابلہ دوسری کوئی بھی حکومت نہیں کر سکے گی۔ اور اس حکومت میں تمام اقوام کو حنیفی ملت پر جمع کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اس مقصد میں یقیناً کامیاب ہوئے لیکن آپ کے اس مقصد کی تکمیل میں آپ کے خلفاء ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ کی کوششوں کو بھی شریک اور شمار کیا جائے۔ ان چاروں بزرگوں نے اس مقصد کو یقیناً پورا کیا۔

فائدہ ⑩ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کا بیان

قرآن کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کی خوشخبری ایک مثال کے ذریعے سناتا ہے وہ یہ ہے۔ محمد رسول اللہ والذین معہ (سورۃ فتح کی آخری آیت) اس مثال میں ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی روح دیکھنے میں آتی ہے۔ دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کام کیا ہے جو دوسرے کسی بھی انسان نے نہیں کیا، قرآن اس تمام کام کو اکیلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام نہیں ٹھہراتا بلکہ آپ کی ذات مبارک کے ساتھ اس کام کو آپ کے اصحاب کا کام بھی ٹھہراتا ہے، اس لیے کسی کو بھی جائز نہیں ہے کہ آپ کی ذات مبارک کو غیبی طاقت کا مالک (اللہ) اور قانون کا مالک (بادشاہ) ٹھہرائے۔ یہ فکر حضرت امام ولی اللہ قدس اللہ سرہ کی کتابوں سے لیا ہوا ہے اور یہی فکر تورات، انجیل اور قرآن سے ثابت ہوتا ہے۔ اس فکر کے ساتھ مندرجہ ذیل باتیں بھی یاد

رکھنی چاہئیں ۔

پہلی بات :۔ وہ حکماء اور عقلمند جن کی سمجھ پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔ ان میں سے کسی نے بھی انسانی اجتماع کے لیے قرآن جیسا پروگرام پیش نہیں کیا۔ سورۃ اسراء کی آیت ۸۸ کے معنی یہ ہیں :۔

(اے رسولؐ کہہ دو اگر انسان اور جن اس پر جمع ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا کوئی لے آئیں تو اس جیسا نہیں لاسکیں گے، اگرچہ بعض بعض کے مددگار بھی بن جائیں)

دوسری بات :۔ صابی مذہب کی جو شاخیں ایران، چین اور ہندوستان میں ہیں ان سب کا مقصد وہی تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن نے پیش کیا ہے اور ان مذاہب میں بہت بڑے درجہ والے آدمی بھی پیدا ہوتے لیکن انہوں نے بھی تمام انسانی جماعتوں کے لئے ابراہیم علیہ السلام کے دین جیسا مقصد پیش نہیں کیا۔ میرے استاذ مولانا عبیداللہ سندھی فرماتے ہیں کہ جو مذہبی کتابیں ہندوستانیوں، ایرانیوں، چینیوں اور یونانیوں کے پاس ہیں ان کی اللہ کے فضل سے ہم کو سمجھ ہے لیکن اس مقصد کو کیسے پورا کیا جائے اس میں وہ بھی قرآن سے بہت پیچھے ہیں۔ ان مذاہب کے بعض بعض آدمیوں میں ایسے افکار اور خیالات موجود ہیں لیکن وہ بھی کوئی جماعت نہ بنا سکے۔ جماعت ایک آدمی سے نہیں بنتی بلکہ اس وقت وجود میں آتی ہے جب بہت سے آدمی ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں اور اس بات پر اتفاق کریں ۔

(فائدہ) میرے استاذ مولانا عبیداللہ سندھی فرماتے ہیں کہ ہندوستان کی تاریخ میں حضرت شاہ ولی اللہ اور آپ کے اتباع سے پہلے کوئی بھی ایسی جماعت نہیں ملتی جس نے ایسی تحریک پیدا کی ہو جو مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کو اکٹھا کر سکے۔ حضرت شاہ صاحب کا فلسفہ جس طرح مسلمانوں میں اپنا اثر ظاہر کرتا ہے اسی طرح ہندوؤں پر اثر کر سکتا ہے۔ کیونکہ حضرت شاہ صاحب کے فلسفہ کی بنیاد ہندوؤں کے فلسفہ کے موافق ہے۔ اس لئے ہم حضرت شاہ ولی اللہ کی امامت ہندوؤں سے بھی منوا سکتے ہیں۔ (یعنی ہندوؤں سے بھی اسلام کی حقانیت قبول کرا سکتے ہیں۔

(تیسری بات) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ عام انسانیت کے رہبر اور ان کو پاک کرنے والے تھے لیکن آپ کی پہلی توجہ اور فکر اپنی قوم قریش کو کمال تک پہنچانے کی تھی کیونکہ

۱۔ عام عرب بیت اللہ شریف کی عزت کرتے تھے، پس بیت اللہ شریف اور ابراہیم علیہ السلام کی وجہ سے وہ قریش کو اپنا دینی سردار سمجھتے تھے۔ بنی اسرائیل کو عرب اگرچہ عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور ان کے علم و فضیلت کے قائل بھی تھے اور ان کو بھی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سمجھتے تھے۔ لیکن چونکہ ان کا تعلق بیت اللہ شریف سے کچھ نہیں تھا اس لئے ان کو اپنا دینی رہبر نہیں سمجھتے تھے۔

۲۔ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد خالص عربوں میں رہ کر عرب بن گئی۔ اس لئے عرب قریش کو اپنا سمجھتے تھے لیکن بنی اسرائیل کو اپنا نہیں سمجھتے تھے۔

۳۔ قریش تجارت کرتے تھے۔ تجارت پیشہ طبقہ انسانیت کا درمیانہ درجہ ہے۔ اس لیے ان کو جس طرح عوام سے واسطہ پڑتا تھا اسی طرح بادشاہوں سے بھی تعلق تھا۔ وہ بادشاہوں اور ان کے حالات کو سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ ایسا معاملہ کرتے تھے کہ وہ ان سے خوش ہو جائیں اور اپنے بیوپار کو ترقی دینے کے لئے عام لوگوں کو بھی اپنی طرف کھینچنا جانتے تھے۔ یہ بات عام عربوں میں نہ تھی۔

۴۔ قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے سے تقریباً ایک سو برس پہلے اکٹھے ہو کر مکہ شریف میں بیت اللہ شریف کے ارد گرد آکر رہنے لگے تھے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادے قصیّ نے کوشش کر کے اکٹھا کیا تھا۔ اس لئے بھی عام عرب ان کی عزت کرتے تھے اور سو برس سے پہلے وہ عرب کے مختلف قبائل میں پھیلے ہوئے تھے اور وہ قبائل قریش کی ایسی عزت کرتے تھے جس طرح آجکل پیروں اور بزرگوں کی اولاد کی ہوتی ہے پس اگر قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تبلیغ سے راہ راست پر آجائیں گے اور عام لوگوں کے فائدہ کے لئے کام کرنا چاہیں گے تو عوام آسانی سے ان کی تابعداری قبول کر لیں گے۔

۵۔ عرب کے شمال میں مختلف یہودی قبائل بستے تھے جو بیوپار کرتے تھے۔ حجاز کے اقتصادی حالات کا دارومدار اکثر انہی پر تھا۔ پس جیسا کہ قریش اور یہودی دونوں تجارت پیشہ تھے۔ اس لئے یہودی ایک تو بیوپار کی وجہ سے دوسرا اس وجہ سے کہ دونوں قومیں ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھیں قریش سے دوستی اور میل ملاپ کی رسمیں جاری رکھتے تھے۔

قریش کی یہ پانچ حالتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے سے پہلے تھیں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی شروع عمر میں اپنے مبعوث ہونے سے پہلے قریش کے بڑوں سے سُنا کہ اللہ تعالےٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی اولاد میں سے ایک ایسا رسول پیدا کرے گا جو اس کی ملت کو دُنیا میں شائع کرے گا تب آپ نے ابراہیمی ملت کو زندہ کرنے اور قریش کو بلندی کے درجہ تک پہنچانے کا خیال کیا کیونکہ یہ کام کرنے کے لئے آپ کی فطرت اور طبیعت خواہش کرتی تھی اور اس کام کے صحیح ہونے کی شہادت ایک تو آپ کا دل دیتا تھا دوسری وہ روایت تھی جو ابراہیم علیہ السلام سے نقل ہوتی ہوتی پہنچی تھی۔

نبوت حاصل ہونے کے بعد یہ کام آپ پر آسان ہو گیا کیونکہ وحی کے ذریعہ سے اس کام کے صحیح ہونے کا آپ کو زیادہ یقین ہو گیا۔ نبوت سے پہلے اور بعد کے حالات میں فرق صرف یہ تھا کہ نبوت سے پہلے آپ نہ نبوت کو جانتے تھے اور نہ اس درجہ کے ملنے کی آپ کو اُمید تھی۔ آپ صرف ابراہیمی ملت کے زندہ کرنے سے قریش کو بلند درجہ پر پہنچانا چاہتے تھے۔ نبوت کے بعد آپ کا پروگرام (دستور العمل) یہ تھا کہ آپ قریش اور قریش کے ارد گرد بسنے والے قبائل کی اصلاح میں مصروف ہوں گے۔ پھر جب اس کام سے فارغ ہوں گے اور آپ کی قوم میں آپ کی طاقت بڑھے گی تو دوسری اقوام کے درجہ بدرجہ اصلاح کریں گے یہاں تک کہ تمام دنیا کی اصلاح کو کمال تک پہنچائیں گے۔

فائدہ ⑪ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا خلاصہ

اطہارت حضرت امام شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی قدس اللہ سرہ کی تعلیم کے بموجب اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سے کچھ چیزوں کو ناپاک ٹھہراتا ہے اور اپنے بدن کو ان پلید چیزوں سے بچانا ہے جیسے پیشاب، پاخانہ وغیرہ، پھر چونکہ یہ بات اس کے دل میں رکھی گئی ہے اور اس سے ایک گھڑی بھی غافل نہیں رہ سکتا اس لئے اس خصلت کو کمال تک پہنچانا اس کے لئے آسان ہے پھر وہ ہر کلام، ہر فکر اور ہر عادت، جسے وہ پیشاب اور پاخانہ کی طرح بُرا سمجھے گا، سے بھی اپنے آپ کو بچائے گا۔ حضرت امام شاہ صاحب کے نزدیک یہ خصلت دین کا چوتھا حصہ ہے۔

۲۔ **اخبات** (تواضع کرنا) اس خصلت کی یہ حقیقت ہے کہ انسان جب اپنے باپ دادوں یا مرشدوں یا استاذوں یا نیک بخت حاکموں اور بادشاہوں میں سے کسی کی عزت کرتا ہے تو جب کسی وقت ان کی خدمت میں حاضر ہوگا تو اپنے دل میں اس وقت ایک قسم کی عاجزی محسوس کریگا اور یہ خواہش کرے گا کہ کاش وہ اس کو کسی کام کے کرنے کا حکم دے اور یہ اس کام کو خوشی سے پورا کر کے اپنی تابعداری کے ذریعے اس کے نزدیک ہو جائے۔ اس آدمی کو اس بزرگ کے نزدیک ہونے میں ایک قسم کی لذت محسوس ہوگی۔ یہ انسان کی فطرت ہے کوئی آدمی اس کو سکھائے یا نہ سکھائے لیکن یہ بات اس کے دل میں رکھی ہوئی ہے۔

اس کے بعد جب وہ اپنے دل کی ہدایت سے یا کسی نیک بخت کے ہدایت کرنے سے اللہ پر ایمان لائے گا اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے آگے عاجزی کرنے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہونے کی خواہش اس درجہ کو پہنچے گی جس میں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے کسی کو بھی شریک نہیں کرے گا۔ تب کہا جائے گا کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے آگے عاجزی کرنے کی خصلت حاصل ہوگئی ہے۔ اس وقت اگر وہ کسی کے آگے عاجزی کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے کرے گا جس کے آگے عاجزی کرنے میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی نہیں دیکھے گا اس کے آگے عاجزی کبھی بھی نہیں کریگا۔ اس کا باپ بھی اگر اس کو کوئی حکم دے گا تو وہ یہ سمجھے گا کہ باپ کی تابعداری کرنے سے میں اللہ کے نزدیک ہو جاؤں گا۔

۳۔ **سماحت**:۔ (سخاوت) اس خصلت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان بہت سی چیزوں کو پسند کرتا ہے اس کا دل چاہتا ہے کہ اچھا کھانا کھائے، اچھے کپڑے پہنے، اچھے مکان میں رہے اس کی خوبصورت عورت ہو اور قوم میں عزت والا ہو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اسکو قرب حاصل ہو، پھر اگر کسی انسان کی طبیعت ایسی ہو جائے کہ اچھا کھانا کھائے اور عورتوں سے صحبت کر کے ان مزوں اور لذتوں کو یاد کرتا ہے تو یہ طبیعت اس کو دوسری ضروریات میں مشغول ہونے اور پورا کرنے سے روکتی رہے گی۔

لیکن اگر اس کی طبیعت ایسی ہوگی کہ کھانا کھائے اور عورتوں کے نزدیک ہونے کے مزہ حاصل کرنے کے بعد جب فارغ ہو اس کو بھلادے اور اس کی طرف کوئی خیال نہ کرے تو یہ انسان اپنے دوسرے کام بھی پورے کر سکے گا۔ اور وہ اپنے اخلاق کو بھی کمال تک پہنچا سکے گا۔ یہ شخص اگر کتاب اٹھا کر پڑھے گا یا مسجد میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کو یاد کرے گا تو وہ اپنے دماغ کو دنیا کے تمام افکار سے پاک کر کے پھر یہ کام کرے گا۔ اس شخص کی طبیعت کی مثال پانی کی طرح ہوگی۔ پانی میں اگر انگلی داخل کرو تو اس میں انگلی چلی جاتی ہے اور جب نکالو تو پانی میں کسی قسم کا بھی سوراخ دکھائی نہیں دیتا اسی طرح یہ انسان جب نفسانی کام کرے گا تو اسکو اچھی طرح سے کریگا اور جب اس سے فارغ ہوگا تو اسکو بھلادے گا۔ اسی عادت کو ہم سخاوت کہتے ہیں۔

۴۔ عدالت: اس خصلت کی انسانی جماعت کو کسقدر ضرورت ہے اس کو ہر ایک جانتا ہے کوئی بھی اجتماع عدالت کے بغیر قائم نہیں ہوتا۔ پس عدالت یا تو انسانیت کے برابر ہے یا ایک دوسرے کو لازم ملزوم ہیں۔ جس انسان، گھر، قبیلہ یا قوم میں انصاف نہ ہوگا اس میں کسی قسم کی بھی انسانیت نہ ہوگی۔

حضرت امام شاہ صاحب ان چار خصلتوں کو تمام احکام کا اصل ٹھہراتے ہیں۔ ان چار خصلتوں کے مخالف جو خصلتیں ہیں انہیں ان کاموں کا اصل ٹھہراتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں روکا ہے۔

ان چار خصلتوں کے علاوہ ایک اور چیز ہے جسے حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ شعائر اللہ (یعنی اللہ کو پہچاننے کی نشانیاں) کہتے ہیں، حضرت امام شاہ صاحب شعائر اللہ کی عزت کرنے کو اللہ تعالیٰ کی ذات کی عزت کے برابر رکھتے ہیں۔ پس جس الٰہی دین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اس کا خلاصہ حضرت امام شاہ صاحب کے پاس یہ ہے کہ انسان اپنے میں مذکورہ بالا چار خصلتوں کے مخالف خصلتوں کو چھوڑنے کی کوشش کرے اور شعائر اللہ کی عزت کرے۔

فائدہ ⑫ شعائر اللہ کی حقیقت

شعائر اللہ کی عزت کیسے کی جائے؟ اس کے لئے خداشناس عارف اور حکما اس بات پر متفق ہیں کہ اس جہان کے پیدا کرنے والے اور اس میں پھیر پھیر کرنے والے کی حقیقت تک انسانوں کی سمجھ پہنچ نہیں سکتی، کچھ خاص طریقے ہیں جن سے لوگ اللہ کے وجود کو سمجھ سکتے ہیں۔

ایک طریقہ جسے تمام انبیاء علیہم السلام پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جیسے سورج کی تجلی (عکس) آئینہ پر پڑتی ہے اور سورج آئینہ کے اندر دیکھنے میں آتا ہے۔ پس اگر وہ آئینہ بھی سورج کے عکس جتنا ہوگا (نہ اس سے بڑا اور نہ چھوٹا) تو لوگ حقیقی سورج میں اور سورج کے اس عکس میں اپنی گذشتہ معلومات لانے کے بغیر فرق معلوم نہیں کرسکیں گے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تجلی اس کی مخلوق میں سے بعض چیزوں پر پڑتی ہے اور وہ چیزیں

نرالی دیکھنے میں آتی ہے پس اگر انسان ان چیزوں کی طرف دیکھنے کے وقت یہ سمجھے گا کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں اور ان چیزوں کی طرف کچھ بھی خیال نہیں کرے گا تو سمجھنا چاہیئے کہ اس نے اللہ کی تجلی کو دیکھا اور وہ تجلیؔ اس کو اس لئے دکھائی گئی ہے کہ اس کو اللہ کی صفات میں سے کوئی صفت معلوم ہو جائے۔ انسان کو جب بھی سمجھ میں آجائے کہ یہ اللہ کی تجلی ہے تو اس پر لازم ہو گا کہ وہ اس تجلیؔ کے آگے اپنی انتہائی طاقت سے جھکے اور اس کی تعظیم کرے۔ اس تجلیؔ کی عزت اللہ تعالیٰ کی عزت کے قائم مقام ہو گی۔ کیونکہ جن چیزوں پر وہ تجلیؔ پڑی ان کی طرف کوئی بھی خیال نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کو اس تجلیؔ کے دیکھنے کے وقت اس شیشے جیسا سمجھا گیا ہے جس پر صورت کا عکس پڑتا ہے یا ان چیزوں کو عینک کی طرح سمجھا گیا ہے، جس سے انسان دور کی چیز کو دیکھ سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ایک تجلیؔ عرش عظیم پر پڑتی ہے اس تجلیؔ کو رحمٰن کہا جاتا ہے وہ یہ آخری تجلی ہے جس تک انسان کی سمجھ اپنے رب کے پہچاننے میں ترقی کر کے پہنچتی ہے۔ اس کے بعد جو تجلیؔ عرش عظیم پر پڑتی ہے اس سے نیچے اس تجلیؔ کی پھر کتنی ہی تجلیاں آسمان اور زمین میں ہیں۔

اگر انسان ان چیزوں کو دیکھتے وقت یہ سمجھے کہ میں اللہ کی تجلیؔ کو دیکھ رہا ہوں اور ان چیزوں کیطرف بھی خیال کرے تو اس وقت ان چیزوں کو شعائر اللہ کہا جائے گا۔

شعائر اللہ کی تعظیم ایمان کے اجزاء میں سے ایک بڑا جزو ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے انسان میں ایک ایسی طاقت رکھی ہے جس کی وجہ سے اسکو بلاواسطہ کے معلوم کرنے میں مزہ آتا ہے اور انسان اپنے تمام مقاصد بلاواسطہ اللہ تک پہنچاتا ہے۔ پس جس کے دل میں شعائر اللہ کی تعظیم ہو گی اس کے دل میں ایمان کے تمام اجزاء میں سے بڑا جزو موجود ہو گا۔

مذکورہ بالا چار خصلتوں کو حاصل کرنے اور شعائر اللہ کی تعظیم کرنے سے انسان ان ملائکہ جیسا ہو جاتا ہے جو اللہ کی تجلیؔ کے آگے رہتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ ان چار خصلتوں اور شعائر اللہ کی تعظیم کو دو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

(۱) التطلع الی الجبروت (یعنی اللہ تعالیٰ کی ان صفات کی طرف دیکھنا جن کا تعلق اس جہان کے نظام سے ہے۔

(۲) التشبہ بالملکوت؛ (یعنی ان ملائکہ جیسا ہونا جو اللہ تعالیٰ کی تجلی کے آگے رہتے ہیں۔

حضرت امام ولی اللہ دہلوی کے نزدیک التطلع الی الجبروت اور التشبہ بالملکوت دونوں وصفوں کا اپنے میں پیدا کرنا انسان کا انتہائی کمال ہے۔ انسان کی پیدائش میں اس کی فطرت کے موافق جو مخفی لطائف اور پاک طاقتیں رکھی ہوئی ہیں ان کی وجہ سے یہ دونوں صفتیں اپنے میں پیدا کرنا اس پر لازم ہے۔

فائدہ :۔ ④ عدالت کی وضاحت

یہاں کچھ باتیں جاننا ضروری ہیں اس کے بعد عدالت کی حقیقت اور ضرورت وضاحت سے سمجھ میں آجائیگی۔

پہلی بات۔ انسان کی حقیقت کیا ہے

حکماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ انسان حیوان ناطق ہے۔ یعنی وہ بڑھنے والا حس رکھنے والا اور ارادہ سے حرکت کرنے اور فکر کرنے والا جسم ہے۔ فکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے افکار کو ترتیب دے سکتا ہے ان کے بہت سے اقسام بنا سکتا ہے اور ان کو اپنے فصیح کلام سے دوسروں کے آگے ظاہر بھی کر سکتا ہے۔
انسان کی اس تعریف کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ کہ انسان میں التطلع الی الجبروت اور التشبہ الی الملکوت کی دو طاقتیں رکھی ہوئی ہیں۔ اس لئے انسان کو یہ دونوں صفتیں اپنے میں پیدا کرنی چاہئیں۔
حکماء کی دوسری جماعت کہتی ہے کہ انسان حیوان یستعمل الآلات۔ یعنی انسان ایسا حیوان ہے جو اوزاروں سے کام لیتا ہے اس تعریف کی تفصیل یہ ہے کہ انسان میں دو باتیں رکھی ہوئی ہیں۔

۱۔ وہ تمام حیوانات کیطرح اپنی غذا حاصل کرنے کے لئے ایسی چیزوں کا محتاج ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے پیدا کیا ہے۔ ان چیزوں کے پیدا کرنے میں نہ تو انسان کی طاقت کام کر سکتی ہے۔ اس کی عقل اس کی رہنمائی کرتی ہے مثلاً انسان پانی پیتا ہے میوہ کھاتا ہے، پانی اور میوہ کو اللہ کی قدرت کے سوا دوسرے کسی نے بھی پیدا نہیں کیا۔

۲۔ دوسری بات انسان میں یہ رکھی ہوئی ہے کہ وہ کسی چیز کو پسند کرتا ہے لیکن اس تک نہ اس کے ہاتھ پہنچ سکتے ہیں نہ اس کی طبعی طاقت اسکو حاصل کر سکتی ہے۔ پس وہ اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے کسی دوسری چیز کو اس چیز کے حاصل کرنے کا ذریعہ بناتا ہے۔ مثلاً وہ درخت کی چوٹی پر میوہ دیکھتا ہے جس تک اس کے ہاتھ نہیں پہنچ سکتے، پس وہ میوہ کو حاصل کرنے کے لئے پتھر مارتا ہے تاکہ میوہ ٹوٹ کے نیچے گر پڑے یا درخت کی کسی ٹہنی کے ذریعے اس کو نیچے اُتار لیتا ہے یہ ہے اوزاروں کا استعمال، اس طرح جوں جوں اس کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں اوزاروں کے استعمال کا شوق بھی بڑھتا جاتا ہے۔ اوزاروں کو حاصل کرنے کے لیے انسان کوشش کرتا رہتا ہے کسی اوزار کے تیار کرنے میں اس کو تھوڑا وقت لگتا ہے اور کسی کی تیاری میں زیادہ تکلیفیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ اس لحاظ سے مالدار اس کو سمجھنا چاہیئے جس کے پاس اوزار بہت ہوں اور غریب اس کو جس کے پاس اوزار نہ ہوں۔ غریب لوگ مالدار لوگوں کے اس لئے تابع ہوتے ہیں کہ مالداروں کے پاس اوزار ہوتے ہیں اور غریب لوگ اپنی طبعی طاقت سے وہ کام نہیں کر سکتے جو اوزاروں کے ذریعے تھوڑے وقت اور کم طاقت

سے ہو سکتے ہیں۔ اس لیے وہ مالداروں کے پاس جاتے ہیں تاکہ ان کی طرف سے ان کی طبعی طاقت ہو اور مالداروں کی طرف سے اوزار، دونوں کو ملا کر کوئی کام کریں اور فائدے میں شریک ہوں۔ پھر اگر آدمی طاقتور بھی ہے تو وہ ترقی کر کے بادشاہ بن جائے گا اور اگر اس کی طاقت دوسرے کی طاقت کے برابر ہے تو اس کو جماعت کا بڑا بنائیں گے۔

انسان اگرچہ بہت سے حیوانوں سے ضعیف ہے لیکن اس پر اللہ کی مہربانی ہے کہ اس کو عقل دی ہے عقل حیوانی طاقت ہے جس پر اس کا ملکی فکر ؏ کرتا ہے پس عقل سے انسان اوزار بناتا ہے اوزاروں کے واسطہ سے وہ اپنی ضعیف طاقت سے تھوڑے وقت میں وہ کام لے سکتا ہے جن سے بڑے سے بڑے جانور بھی عاجز ہیں۔ اس کی عقل تمام حیوانی طاقتوں کی امام ہے۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اوزاروں کے استعمال کو اور ان کے واسطہ سے تھوڑی طاقت سے چیزوں کے حاصل کرنے کو ارتفاق کہتے ہیں۔

پھر ارتفاق کی کئی قسمیں ہیں۔

۱۔ وہ ارتفاق جس سے کوئی بھی انسان، خواہ کہیں ہو، چھوٹ نہیں سکتا۔

۲۔ آداب المعاش (زندگی گذارنے کے طریقے)

۳۔ تدبیر المنزل (گھریلو زندگی کے طریقے)

۴۔ فن المعاملات (لوگوں کے آپس میں معاملات کے طریقے)

۵۔ سیاستہ المدنیہ (شہری نظم ونسق اور زندگی کے طریقے)

۶۔ سیاستہ مدن (یعنی شہروں کو ملا کر ان کو کس طرح چلایا جائے پھر شہروں کو ملا کر چلانے کے کئی اقسام ہیں، ان میں سے ایک قسم وہ ہے جس کو حضرت امام شاہ ولی اللہ الدہلوی قدس اللہ سرہ خلافت کہتے ہیں ؏ - - - - - - - - - - - - - - کے باوجود مقابلہ نہ کر سکیں) قائم نہ ہو جائے۔ کسی آدمی کے لئے بھی سستی کر کے بیٹھ جانا جائز نہیں، یہ بات اس وقت ممکن ہو سکتی ہے جب وہ اوزاروں کے استعمال میں درجہ کمال کو پہنچ جائے۔

فائدہ (۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بھی تعلیم انسانی فطری صفات کے خلاف نہیں

حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ مذکورہ بالا ارتفاقات کو انسانی فطرت سے باہر کی چیز نہیں کہتے جو انسان

؏ اصل مسودہ سے مٹا ہوا ہے ۱۲ ناشر

کے ساتھ چمٹا دی گئی ہو بلکہ فرماتے ہیں کہ انسانی فطرت ان تمام ارتفاقات کی خواہش کرتی ہے کیونکہ اگر کوئی انسان شہروں سے دور کسی جنگل یا بیابان میں پیدا ہو اور کسی سے بھی کوئی رسم و رواج نہ سیکھے تب بھی اس کو بھوک پیاس لگے گی۔ عورت کی خواہش ہوگی اور شادی کرنے کے بعد اس کے بال بچے پیدا ہوں گے جس کے بعد بہت سے گھر بن جائیں گے اور ان میں خرید و فروخت اور ان کے لین دین ہوں گے۔ اس طرح پہلا ارتفاق ترتیب وار موجود ہو جائے گا۔ پھر جب آبادی بڑھے گی تو ضرور ان میں بلند اخلاق آدمی پیدا ہوں گے اور ان کے سامنے ایسے معاملات پیش آئیں گے جن کی وجہ سے سب ارتفاقات موجود ہو جائیں گے۔ اس لئے کسی قوم میں انصاف کی بادشاہی کا پیدا ہونا انسانی نوع کی خواہش کے مطابق ہے۔

اب سمجھنا چاہیے کہ انسان میں (۱) التطلع الی الجبروت (۲) التشبہ بالملکوت (۳) ارتفاقات کو کمال تک پہنچانے کی تمام صفات ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تطلع الی الجبروت کا سبق اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنے، شعائر اللہ کی تعظیم کرنے اور التشبہ بالملکوت کا سبق آپس میں ایسے بلند اخلاق کے پیدا کرنے سے سکھاتے ہیں، جن کا فائدہ خاص انہی کو نہیں پہنچتا بلکہ عام انسانی نوع کو پہنچتا ہے اور اس کے بعد ان کی ذات کو بھی پہنچے گا۔ کیونکہ وہ بھی تو انسانی نوع کے افراد میں سے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارتفاقات کی بھی تعلیم دیتے ہیں (یعنی جو چیزیں اللہ تعالےٰ نے لوگوں کے لئے دنیا اور آخرت میں پیدا کی ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ فائدے کم سے کم وقت اور تھوڑی طاقت خرچ کر کے کیسے خرچ کیے جائیں) اس طرح کہ ملائکہ ان کے کام کو دیکھ کر تعجب کریں، یہ تینوں باتیں تفصیل سے کسی بھی شریعت میں بیان نہیں کی گئیں۔

فائدہ ⑮ انسان کی تشریح اور اس کے مختلف مقامات میں مختلف اور اس کے اچھے اعمال کا بیان

ترتیب وار رکھی ہوئی چیزوں میں سے جب کوئی چیز اثر کرے گی تو اس چیز کا اثر ترتیب وار تمام چیزوں میں ان کی استعداد اور لیاقت کے موافق ہو گا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے مختلف رنگدار شیشوں کو ترتیب وار رکھا جائے اور پھر ایک شیشے کے سامنے موم بتی جلائی جائے، اس بتی کی روشنی تمام شیشوں میں ان کے رنگوں کے موافق ظاہر ہو گی۔ ظاہر میں تمام شیشوں میں جدا جدا روشنی نظر آئے گی۔ لیکن ہر عقلمند ایسا ہی کہے گا کہ جو روشنی پہلے شیشے میں ظاہر ہوئی وہ ہی تمام شیشوں میں نظر آتی ہے۔

اس بات کے سمجھنے کے بعد انسان کی حقیقت کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ انسان چار چیزوں سے بنا ہوا ہے (۱) بدن (۲) ہوائی روح (۳) نفسِ ناطقہ (۴) ملکوتی روح (یعنی الٰہی روح، ملکوتی روح اور الٰہی روح

ایک ہی چیز کے نام ہیں) حظیرۃ القدس میں انسانی نوع کا امام ہے جس کو امام النوع یا انسان کبیر (یعنی بڑا انسان) کہا جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو نوع انسانی کے امام کے بے شمار عکس ظاہر ہوئے جسطرح آئینہ میں ہمارے عکس ظاہر ہوتے ہیں ان عکسوں میں ان تمام صفات کے عکس بھی آگئے جو اس بڑے انسان میں ہیں۔ ان میں حظیرۃ القدس کے ملائکہ کی روحانی طاقت اور نیچے طبقہ والے ملائکہ کی روحانی طاقت کے عکس بھی آگئے جو ستارے اس دنیا کی چیزوں پر اپنا اثر پیدا کرتے ہیں، ان کی طاقت کے عکس بھی آگئے۔

اسی طرح بڑے انسان کے دل پر جو اللہ تعالیٰ کی تجلی پڑتی ہے۔ اس کا عکس بھی ان عکسوں میں آگیا ان عکسوں کو ملکوتی روح کہا جاتا ہے۔ یہ ملکوتی روحیں ہر انسان کی جدا جدا ہیں۔ پھر ایک طویل عرصہ کے بعد ملکوتی روحوں کے عکس عالم مثال کے تختہ پر آئے۔ دونوں عکسوں میں اتنا ہی فرق ہے جیسے چھوٹی تصویر کو بڑا اور بڑی تصویر کو چھوٹا کیا جائے باقی کوئی چیز جو ان میں بڑھائی یا کم کی گئی ہو وہ دیکھنے میں نہیں آئے گی دونوں عکس ایک جیسے نظر آئیں گے، ان کا آپس میں ایسا ہی تعلق ہے جیسے روح اور جسم کا۔ عالم مثال کا عکس ملکی روح کا جسم ہو گا اور ملکی روح اس کی روح ہو گا۔ اس کے بعد جب ماں کے رحم میں منی اور حیض کا خون اکٹھا ہوتا ہے اور وہاں کا نفس اس کی تدبیر کرتا ہے تب اس میں دل اور دماغ اور جگر ظاہر ہوتے ہیں، پھر نیچے میں بدن کے واسطے سے ایک قسم کی لطیف ہوا تیار ہوتی ہے۔ یہ لطیف ہوا بدن کے لطیف اخلاط سے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ انسان میں جو سننے، دیکھنے اور دوسرے کاموں کی طاقتیں ہیں۔ وہ اسی لطیف ہوا کی طاقتیں ہیں۔ اس لطیف ہوا کے ساتھ وہ عالم مثال میں پیدا شدہ نورانی روح چمٹ جاتی ہے جیسے سورج کی صورت آئینے کے ساتھ چمٹ جاتی ہے۔ اب وہ نورانی روح لطیف ہوا میں اثر کرے گی اور وہ لطیف ہوا اس نورانی روح میں اثر کرے گی۔ اس وقت اس نورانی روح کو نفس ناطقہ (یعنی فکر کرنیوالا نفس) کہا جاتا ہے اور اس لطیف ہوا کو اس نورانی روح کا جسم اور اس نورانی روح کو اس کی روح سمجھنا چاہیئے، یہ دونوں کبھی بھی نہ اس دنیا میں اور نہ ہی جنت اور جہنم میں ایک دوسرے سے جدا ہوں گی۔ اس کے بعد یہ بات سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ لطیف ہوا جو انسان کے دل میں لطیف خلطوں سے پیدا ہوتی ہے اس کی طاقتیں جب کام کرتی ہیں تب کم ہوتی رہتی ہیں پھر اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بدن لطیف ہوا کو تیار کرتا رہتا ہے۔ اس وقت اس لطیف ہوا کو نسمہ یا ہوائی روح یا برقی روح کہا جاتا ہے۔ انسان کے بدن کو لطیف ہوا کا جسم اور لطیف ہوا کو اس کی روح سمجھنا چاہیئے۔ انسان کی یہ ہوائی روح جو انسانی صورت کے سبب باقی حیوانات سے جدا ہوتی ہے وہ نفس ناطقہ کے سبب ہوتی ہے ورنہ ہوائی روح تمام حیوانات میں ایک جیسی ہے۔ اس کے بعد جب انسان کا بدن لطیف ہوا کے پیدا کرنے سے بالکل عاجز ہو گا تو وہ عاجزی انسان کی موت ہے۔ بدن کے بیکار ہونے

اس وقت باقی بچی ہوئی لطیف ہوا اور نورانی
سے بعضے اس کو قبر میں دفن کرتے ہیں اور بعضے جلا دیتے ہیں۔ اس کو اس کی لیاقت کے موافق روشن جسم یا تاریک
روح انسان کے بدن سے جدا ہوتی ہے پھر نورانی روح اس کو اس کی لیاقت کے موافق روشن جسم یا تاریک
جسم عالم مثال سے دلاتا ہے۔ اور وہ جسم لطیف ہوا کی کمی کو پورا کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح انسان کی اس کے مرنے
کے بعد حفاظت کی جاتی ہے۔ عالم مثال کا یہ بدن قیامت کے قائم ہونے تک قائم رہے گا۔ اس کے
بعد اللہ تعالیٰ اسکو یا تو دنیاوی جسم دے گا یا ایسا جسم دے گا جو دنیاوی جسم سے بھی مناسبت رکھے گا اور عالم

مثال والے جسم سے بھی۔
انسان کی حقیقت سمجھنے کے بعد دو باتیں سمجھنا چاہئیں (۱) ایک یہ کہ دنیا میں انسان مذکورہ بالا اجزاء
کے مجموعہ کو کہا جاتا ہے۔ انسان کے مرنے کے بعد دنیا والے بدن کے علاوہ باقی تین اجزاء کے مجموعہ کو انسان
کہا جائیگا۔ اس کے بعد انسان ترقی کر کے جب اس درجہ کو پہنچے گا جہاں انسان کی ہوائی روح پہنچ نہیں سکتی،
بلکہ فقط اس کا نفس ناطقہ پہنچ سکے گا۔ تو وہاں انسان ملکوتی روح اور نفس ناطقہ کو کہا جائیگا۔ اسی طرح جب
انسان ترقی کر کے وہاں پہنچے گا جہاں اس کا نفس ناطقہ بھی نہیں پہنچ سکتا تو وہاں انسان فقط ملکوتی روح کو کہا

جائے گا۔
۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان کے یہ چار اجزاء ترتیب وار ہیں تب یہ چیز ملکوتی روح میں ظاہر ہوگی وہ نفس
ناطقہ میں بھی اس کے مزاج کے موافق ظاہر ہوگی اور جو چیز نفس ناطقہ میں ظاہر ہوگی وہ ہوائی میں بھی اس کے مزاج
کے موافق ظاہر ہوگی اور جو چیز ہوائی روح میں ظاہر ہوگی وہ بدن میں بھی اس کی قابلیت کے موافق ظاہر ہوگی،
پس انسان کے ہر ایک جزء میں سے اگرچہ ظاہر میں جدا جدا صورت نظر آئے گی۔ لیکن حکیم کی نظر میں وہ ایک ہی چیز
ہے پس سمجھنا چاہیئے کہ تجلی جو انسانی نوع کے امام پر پڑتی ہے وہ ملکوتی روح پر چمکتی ہوئی اور ترتیب وار نیچے
اترتی ہوئی بدن تک پہنچتی ہے، بدن پر عمل کرنے کے بعد پھر جیسے نیچے اترتی تھی ایسے ہی چڑھتی ہوئی ملکوتی
روح تک پہنچے گی۔ یہ انسانی فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے۔ پس تمام ارتفاقات سے بہتر
ارتفاق وہ ہے کہ انسان جب کوئی کام بدن سے کرے تو اس کام کا اثر ملکوتی روح تک پہنچے۔ اور سب سے
بُرا ارتفاق وہ ہے کہ انسان جب کوئی کام بدن سے کرے تو اس کام کی روح کو اس کی ہوائی روح بھی قبول نہ
کرے، جیسے زنا اور چوری جس پر انسان کو آخر پشیمان ہونا اور پچھتانا پڑتا ہے،
اس سے اچھا کام وہ ہے جس کی روح کو انسان کی ہوائی روح قبول کرے لیکن ان کا نفس ناطقہ اور الٰہی روح
قبول نہ کرے جیسے لوہار اور بڑھئی کے پیشے اور دوسرے ہنر کہ لوگوں کو ان ہنروں کی اپنی زندگی کے لئے
ضرورت بھی ہے لیکن ان کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا جاتا اور جیسے وہ کام جن سے
انسان کا تعلق عالم مثال میں فقط جنوں سے ہوتا ہے اور ملائکہ کے ساتھ نہیں ہوتا۔
اس سے بھی زیادہ اچھا کام وہ ہے جس کو انسان کا نفس ناطقہ بھی قبول کرے لیکن اس کی الٰہی روح قبول

نہ کرے (یہ عقلی بات ہے ورنہ اس کی ظاہر میں کوئی بھی مثال موجود نہیں)

سب سے بہتر کام وہ ہے جسے انسان کی ملکوتی روح بھی قبول کرے کیونکہ وہ عمل ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا اور اس سے اُسے انتہائی خوشی حاصل ہوگی جس سے زیادہ خوشی پہنچنے کا امکان ہی نہیں جب انسان میں اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے فائدہ حاصل کرنے کے وقت مذکورہ چارا خلاق ہوں گے اور انسان کا نفس ناطقہ شعائر اللہ کی عزت کرنے سے اللہ کیطرف دیکھنے والا ہوگا تب اس کی انسانیت بھی کمال کو پہنچے گی اور اس کے کاموں کی روح بھی اس کی الٰہی روح تک پہنچے گی۔

فائدہ (۱۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا خلاصہ

پندرھویں فائدہ میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان کے سمجھنے کے بعد یہ جاننا چاہیئے کہ ہم جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کو راستہ دکھانے والے اور ان کو پاک کرنیوالے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو ارتفاقات صالحہ (یعنی اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی دنیا سے بہت سا فائدہ حاصل کرنے) کا ایسا طریقہ سکھاتے ہیں جس سے ان کاموں کی روح ملکوتی روح تک پہنچتی ہے اور مذکورہ بالا چار اخلاق بھی ان میں پیدا کرتے ہیں اور شعائر اللہ کی تعظیم کرانے سے اللہ تعالیٰ کی تجلی کی طرف توجہ کرنا بھی سکھاتے ہیں پھر جب آپ کی قوم ہدایت پر آجائے گی اور پاک ہو جائے گی تو آپ ان کو حکم کریں گے کہ دنیا کی اقوام کو بھی اس تعلیم اور تہذیب پر اکٹھا کریں جس پر وہ ہیں لیکن اس تعلیم وتہذیب کا ان کو ایسا آسان طریقہ سکھائیں گے کہ وہ آسانی سے سکھا سکیں اور اس کام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام سمجھا جائیگا۔ یہ معنی ہیں خلافت قائم کرنے کے۔

اس معنی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور ان کے بعد ابو بکرؓ اور عمر رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں سے یہ کام اللہ تعالیٰ نے پورا کیا اور دونوں خلفاء کے کام کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام سمجھا گیا۔ پس اس معنی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارض مقدسہ (پاک زمین) کو جس کا اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا۔ ابراہیمی ملت کی روشنی سے روشن کیا اور مکہ معظمہ، بیت المقدس اور مدینہ منورہ کی مسجدوں کو اس تعلیم کا مرکز بنایا اور قیصر وکسرے کی دو بڑی حکومتوں کو برباد کر کے ان کی رعایا کو دو راستوں میں سے ایک رستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ وہ راستے یہ ہیں کہ یا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو اختیار کر کے اسلامی اجتماع میں داخل ہو جائیں یا اسلامی اجتماع کو خراج دے کر ان کے حکم کے فرمان بردار رہیں اور اسلامی دین کی جو خاص نشانیاں (شعائر اللہ) ہیں ان کی بے حرمتی نہ کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا جن لوگوں نے آج تک خلافتیں قائم کی ہیں ان سب سے کامل خلافت وہ ہے

ایک ہی چیز کے نام ہیں) حظیرۃ القدس میں انسانی نوع کا امام ہے جس کو امام النوع یا انسان کبیر (یعنی بڑا انسان) کہا جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے پیدا کرنیکا ارادہ کیا تو نوع انسانی کے امام کے بے شمار عکس ظاہر ہوئے جسطرح آئینہ میں ہمارے عکس ظاہر ہوتے ہیں ان عکسوں میں ان تمام صفات کے عکس بھی آ گئے جو اس بڑے انسان میں ہیں۔ ان میں حظیرۃ القدس کے ملائکہ کی روحانی طاقت اور نیچے طبقہ والے ملائکہ کی روحانی طاقت کے عکس بھی آ گئے جو ستارے اس دنیا کی چیزوں پر اپنا اثر پیدا کرتے ہیں، ان کی طاقت کے عکس بھی آ گئے۔

اسی طرح بڑے انسان کے دل پر جو اللہ تعالیٰ کی تجلی پڑتی ہے۔ اس کا عکس بھی ان عکسوں میں آگیا ان عکسوں کو ملکوتی روح کہا جاتا ہے۔ یہ ملکوتی روحیں ہر انسان کی جدا جدا ہیں۔ پھر ایک طویل عرصہ کے بعد ملکوتی روحوں کے عکس عالم مثال کے تختہ پر آئے۔ دونوں عکسوں میں اتنا ہی فرق ہے جیسے چھوٹی تصویر کو بڑا اور بڑی تصویر کو چھوٹا کیا جائے باقی کوئی چیز جو ان میں بڑھائی یا کم کی گئی ہو وہ دیکھنے میں نہیں آئے گی دونوں عکس ایک جیسے منظر آئیں گے، ان کا آپس میں ایسا ہی تعلق ہے جیسے روح اور جسم کا۔ عالم مثال کا عکس ملکی روح کا جسم ہو گا اور ملکی روح اس کی روح ہو گا۔ اس کے بعد جب ماں کے رحم میں منی اور حیض کا خون اکٹھا ہوتا ہے اور ماں کا نفس اس کی تدبیر کرتا ہے تب اس میں دل اور دماغ اور جگر ظاہر ہوتے ہیں، پھر پیچھے میں بدن کے واسطے سے ایک قسم کی لطیف ہوا تیار ہوتی ہے۔ یہ لطیف ہوا بدن کے لطیف اخلاط سے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ انسان میں جو سننے، دیکھنے اور دوسرے کاموں کی طاقتیں ہیں۔ وہ اسی لطیف ہوا کی طاقتیں ہیں۔ اس لطیف ہوا کے ساتھ وہ عالم مثال میں پیدا شدہ نورانی روح چمٹ جاتی ہے جیسے سورج کی صورت آئینے کے ساتھ چمٹ جاتی ہے۔ اب وہ نورانی روح لطیف ہوا میں اثر کرے گی اور وہ لطیف ہوا اس نورانی روح میں اثر کرے گی۔ اس وقت اس نورانی روح کو نفس ناطقہ (یعنی فکر کرنیوالا نفس) کہا جاتا ہے اور اس لطیف ہوا کو اس نورانی روح کا جسم اور اس نورانی روح کو اس کی روح سمجھنا چاہیئے، یہ دونوں کبھی بھی نہ اس دنیا میں اور نہ ہی جنت اور جہنم میں ایک دوسرے سے جدا ہوں گی۔ اس کے بعد یہ بات سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ لطیف ہوا جو انسان کے دل میں لطیف خلطوں سے پیدا ہوتی ہے اس کی طاقتیں جب کام کرتی ہیں تب کم ہوتی رہتی ہیں پھر اس کمی کو پورا کرنے کے لیئے بدن لطیف ہوا کو تیار کرتا رہتا ہے۔ اس وقت اس لطیف ہوا کو نسمہ یا ہوائی روح یا برقی روح کہا جاتا ہے۔ انسان کے بدن کو لطیف ہوا کا جسم اور لطیف ہوا کو اس کی روح سمجھنا چاہیئے۔ انسان کی یہ ہوائی روح جو انسانی صورت کے سبب باقی حیوانات سے جدا ہوئی ہے وہ نفس ناطقہ کے سبب ہوتی ہے ورنہ ہوائی روح تمام حیوانات میں ایک جیسی ہے۔ اس کے بعد جب انسان کا بدن لطیف ہوا کے پیدا کرنے سے بالکل عاجز ہو گا تو وہ عاجزی انسان کی موت ہے۔ بدن کے بیکار ہونے

سے بعضے اس کو قبر میں دفن کرتے ہیں اور بعضے جلا دیتے ہیں۔ اس وقت باقی بچی ہوئی لطیف ہوا اور نورانی روح انسان کے بدن سے جدا ہوتی ہے پھر نورانی روح اس کو اس کی لیاقت کے موافق روشن جسم یا تاریک جسم عالم مثال سے دلاتا ہے۔ اور وہ جسم لطیف ہوا کی کمی کو پورا کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح انسان کی اس کے مرنے کے بعد حفاظت کی جاتی ہے۔ عالم مثال کا یہ بدن قیامت کے قائم ہونے تک قائم رہے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اسکو یا تو دنیاوی جسم دے گا یا ایسا جسم دے گا جو دنیاوی جسم سے بھی مناسبت رکھے گا اور عالم مثال والے جسم سے بھی۔

انسان کی حقیقت سمجھنے کے بعد دو باتیں سمجھنا چاہئیں (۱) ایک یہ کہ دنیا میں انسان مذکورہ بالا اجزاء کے مجموعہ کو کہا جاتا ہے۔ انسان کے مرنے کے بعد دنیا والے بدن کے علاوہ باقی تین اجزاء کے مجموعہ کو انسان کہا جائیگا۔ اس کے بعد انسان ترقی کر کے جب اس درجہ کو پہنچے گا جہاں انسان کی ہوائی روح پہنچ نہیں سکتی، بلکہ فقط اس کا نفس ناطقہ پہنچ سکے گا۔ تو وہاں انسان ملکوتی روح اور نفس ناطقہ کو کہا جائیگا۔ اسی طرح جب انسان ترقی کر کے وہاں پہنچے گا جہاں اس کا نفس ناطقہ بھی نہیں پہنچ سکتا تو وہاں انسان فقط ملکوتی روح کو کہا جائے گا۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان کے یہ چار اجزاء ترتیب وار ہیں جب یہ چیز ملکوتی روح میں ظاہر ہوگی وہ نفس ناطقہ میں بھی اس کے مزاج کے موافق ظاہر ہوگی اور جو چیز نفس ناطقہ میں ظاہر ہوگی وہ ہوائی میں بھی اس کے مزاج کے موافق ظاہر ہوگی اور جو چیز ہوائی روح میں ظاہر ہوگی وہ بدن میں بھی اس کی قابلیت کے موافق ظاہر ہوگی، پس انسان کے ہر ایک جزو میں سے اگرچہ ظاہر میں جدا جدا صورت نظر آئے گی۔ لیکن حکیم کی نظر میں وہ ایک ہی چیز ہے پس سمجھنا چاہیئے کہ تجلی جو انسانی نوع کے امام پر پڑتی ہے وہ ملکوتی روح پر چمکتی ہوئی اور ترتیب وار نیچے اترتی ہوئی بدن تک پہنچتی ہے، بدن پر عمل کرنے کے بعد پھر جیسے نیچے اترتی تھی ویسے ہی چڑھتی ہوئی ملکوتی روح تک پہنچے گی۔ یہ انسانی فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے۔ پس تمام ارتفاقات سے بہتر ارتفاق وہ ہے کہ انسان جب کوئی کام بدن سے کرے تو اس کام کا اثر ملکوتی روح تک پہنچے۔ اور سب سے بڑا ارتفاق وہ ہے کہ انسان جب کوئی کام بدن سے کرے تو اس کام کی روح کو اس کی ہوائی روح بھی قبول نہ کرے، جیسے زنا اور چوری جس پر انسان کو آخر پشیمان ہونا اور پچھتانا پڑتا ہے۔

اس سے اچھا کام وہ ہے جس کی روح کو انسان کی ہوائی روح قبول کرے لیکن ان کا نفس ناطقہ اور الٰہی روح قبول نہ کرے جیسے لوہار اور بڑھئی کے پیشے اور دوسرے ہنر کہ لوگوں کو ان ہنروں کی اپنی زندگی کے لئے ضرورت بھی ہے لیکن ان کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا جاتا اور جیسے وہ کام جن سے انسان کا تعلق عالم مثال میں فقط جنوں سے ہوتا ہے اور ملائکہ کے ساتھ نہیں ہوتا۔

اس سے بھی زیادہ اچھا کام وہ ہے جس کو انسان کا نفس ناطقہ بھی قبول کرے لیکن اس کی الٰہی روح قبول

نہ کرے (یہ عقلی بات ہے ورنہ اس کی ظاہر میں کوئی بھی مثال موجود نہیں)

سب سے بہتر کام وہ ہے جسے انسان کی ملکوتی روح بھی قبول کرے کیونکہ وہ عمل ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا اور اس سے اُسے انتہائی خوشی حاصل ہوگی جس سے زیادہ خوشی پہنچنے کا امکان ہی نہیں جب انسان میں اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے فائدہ حاصل کرنے کے وقت مذکورہ چارا خلاق ہوں گے اور انسان کا نفس ناطقہ شعائراللہ کی عزت کرنے سے اللہ کیطرف دیکھنے والا ہوگا تب اس کی انسانیت بھی کمال کو پہنچے گی اور اس کے کاموں کی روح بھی اس کی الٰہی روح تک پہنچے گی۔

فائدہ (۱۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا خلاصہ

پندرھویں فائدہ میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان کے سمجھنے کے بعد یہ جاننا چاہیئے کہ ہم جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کو راستہ دکھانے والے اور ان کو پاک کرنیوالے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو ارتفاقات صالحہ (یعنی اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی دنیا سے بہت سا فائدہ حاصل کرنے) کا ایسا طریقہ سکھاتے ہیں جس سے ان کاموں کی روح ملکوتی روح تک پہنچتی ہے اور مذکورہ بالا چار اخلاق بھی ان میں پیدا کرتے ہیں اور شعائراللہ کی تعظیم کرانے سے اللہ تعالیٰ کی تجلی کی طرف توجہ کرنا بھی سکھاتے ہیں پھر جب آپ کی قوم ہدایت پر آجائے گی اور پاک ہو جائے گی تو آپؐ ان کو حکم کریں گے کہ دنیا کی اقوام کو بھی اس تعلیم اور تہذیب پر اکٹھا کریں جس پر وہ ہیں لیکن اس تعلیم و تہذیب کا ان کو ایسا آسان طریقہ سکھائیں گے کہ وہ آسانی سے سکھا سکیں اور اس کام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام سمجھا جائیگا۔ یہ معنی ہیں خلافت قائم کرنے کے۔

اس معنی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور ان کے بعد ابوبکرؓ اور عمرؓ رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں سے یہ کام اللہ تعالیٰ نے پورا کیا اور دونوں خلفاء کے کام کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام سمجھا گیا۔ پس اس معنی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارض مقدسہ (پاک زمین) کو جس کا اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا۔ ابراہیمی ملت کی روشنی سے روشن کیا اور مکہ معظمہ، بیت المقدس اور مدینہ منورہ کی مسجدوں کو اس تعلیم کا مرکز بنایا اور قیصر و کسرے کی دو بڑی حکومتوں کو برباد کر کے ان کی رعایا کو دو راستوں میں سے ایک رستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ وہ راستے یہ ہیں کہ یا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو اختیار کر کے اسلامی اجتماع میں داخل ہو جائیں یا اسلامی اجتماع کو خراج دے کر ان کے حکم کے فرماں بردار رہیں اور اسلامی دین کی جو خاص نشانیاں (شعائراللہ) ہیں ان کی بے حرمتی نہ کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا جن لوگوں نے آج تک خلافتیں قائم کی ہیں ان سب سے کامل خلافت وہ ہے

جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی اور اس کا پروگرام اللہ تعالیٰ نے ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں سے پورا کیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانی نوع کے لئے ایک مقدس مثال بنایا ہے کہ ان کی ہمت سے ایک ایسی خلافت قائم ہو گئی جس کو پانچ سو برس تک آپ کی قوم قریش نے چلایا اور دوسرے پانچ سو برس دوسری اقوام نے چلایا جنہوں نے آپ کے دین کو سچے دل سے قبول کیا۔ سورہ جمعہ میں آیت ۲ سے ۴ تک اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ ان آیات میں آخرین کے لفظ سے مطلب فارس، روم، ہندوستان اور ترک ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو دنیا میں پھیلانے کے لئے حکومتیں قائم کیں۔ اس کے بعد جب کبھی انسانی نوع کا نظام ارتفاقات میں ترقی کرنے سے بدلتا رہے گا تو حکومتوں کی صورت بھی انسانی اجتماع کے موافق ضرور بدلتی رہے گی۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہزار سال کے بعد جب لوگوں کا نظام ارتفاقات میں ترقی کرنے سے بدلا تو مسلمانوں کے رہنما اپنے پرانے طریقہ کو بدل نہ سکے۔ اس لئے ان کی شان و شوکت فنا ہو گئی۔ مولانا مرحوم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کے فضل سے جب ہمیں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے طریقہ پر چلنے سے دین کی سمجھ پیدا ہوئی۔ تب ہم نے سمجھا کہ ہزار سال کے بعد جو مسلمانوں کی شان و شوکت فنا ہوئی اس میں قصور ہمارا ہی ہے اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیم میں کوئی قصور نہ تھا۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۔